قومی زبان

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

اپریل ۱۹۸۶ء
جلد ۵۷
شمارہ ۴

مضمون نما

اداریہ ۳
تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ۵
اقبال یادگار۔ بھوپال ۱۳
پیر حسام الدین راشدی ..... عبدالسمیع خاں ۱۷
منشی محمد سعید کا مٹوی ..... حکیم اسرار احمد کریوی ۲۱

غزل نما۔
سراج اورنگ آبادی ..... ادا جعفری ۲۷
غیر افسانوی طرزِ تحریر ..... پروفیسر یونس شرر ۳۳
جیون کتھا ..... عاصی کرنالی ۴۱
اردو گنتی کے چند پہلو ..... افضال احمد ۴۵

پیشِ رفت
تہران میں علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت ..... ڈاکٹر کلیم سہسرامی ۵۳

تمغہائے رنگ رنگ
گونگی توپ ..... ماہر احمد حسّونہ / قطب اللہ ۵۷
نظم ..... شاہ عبداللطیف بھٹائی ۶۱
نظم ..... خوش حال خان خٹک ۶۲
پشتو ادب میں ڈراما ..... پروفیسر محمد اعظم اعظم ۶۳

گوشۂ طلبہ
ہیروڈوٹس ــ تاریخ کا بانی ..... ڈاکٹر مبارک علی ۶۷
دنیا میری نظر میں ..... البرٹ آئن اسٹائن / تلخیص: ممتاز احمد خان ۷۱
رفتارِ ادب ۷۵
گرد و پیش ۷۹
ردِ عمل ۸۳
حروفِ تازہ ۸۴
نئے خزانے ۸۹

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی
ادا جعفری
ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر معاون

ادیب سہیل

قیمت ۵ روپے

بدل اشتراک
فی پرچہ ..... ۵ روپے
سالانہ ..... ۵۰ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) ..... ۱۰۰ روپے

بیرونِ ملک
فی پرچہ ..... ۱۰ روپے
سالانہ ..... ۱۵۰ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) ..... ۱۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱ فون: ۷۲۳۰۲۳۳

اداریہ

قومی زبان کے بعض ہمدردوں اور بہی خواہوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس میں شائع ہونے والا مواد روکھا پھیکا ہوتا ہے اور پروفیشنلزم کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ان کرم فرماؤں نے یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ قومی زبان میں ادبی مقالوں، سفرناموں اور دلچسپ مضامین کی اشاعت پر توجہ کی جائے۔ ہمیں اس مشورے کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا اگر قومی زبان کا مخصوص کردار اور اس کی اشاعت کا مطمحِ نظر پوری طرح واضح نہ ہوتا۔

قومی زبان ایک تحریک کا علم بردار اور ایک ادارے کا ترجمان ہے۔ اس کی اشاعت کا مقصد اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کو زبان و ادب کی ترقی، زبان و ادب کے بارے میں ملکی اور عالمی سرگرمیوں سے باخبر رکھنا، نئی مطبوعات کی نشاندہی کرنا۔ طلبہ کو اردو ذریعہ تعلیم کے توسط سے نئے موضوعات کی معلومات فراہم کرنا، علاقائی اور غیر ملکی ادب کے تراجم پیش کرنا ہے۔ چنانچہ قومی زبان میں جو مواد پیش کیا جارہا ہے وہ اسی نہج پر مرتّب کیا جاتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ملکی اور غیر ملکی سطح پر قارئین کی اکثریت اس مواد سے بھرپور استفادہ کرتی ہے اور ہماری کوششوں کو سراہتی ہے۔

یہاں یہ بات واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ قومی زبان اردو کے عام رسالوں کی طرح ایک ادبی مجلّہ نہیں ہے اگرچہ اس میں ادبی مسائل سے تعلق رکھنے والے مضامین بھی شائع کیے جاتے ہیں۔ تاہم اس کا مقصد ادب کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ہمارے بعض قارئین کو قومی زبان میں پروفیشنلزم کی کمی محسوس ہوئی ہے کہ ہم نے اسے پیشہ ورانہ صحافت کا مظہر نہیں بنایا نہ عام ادبی رسائل کی طرح اسے مرتب کیا بلکہ اس کی ترتیب میں واضح مقاصد کو سامنے رکھا۔ ہمارے سلسلہ وار مضامین۔ حروفِ تازہ، گردوپیش اور نئے خزانے ہمارے مقاصد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ نئے خزانے قومی زبان کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو کسی دوسرے رسالے میں نظر نہیں آتا۔ قومی زبان کا تشخص اور حوالہ ایسے ہی سلسلہ مضامین سے ہے۔ سفرنامے اور دلچسپ مضامین ہر رسالے میں شائع ہوتے ہیں لیکن قومی زبان خصوصی نوعیت کا مواد شائع کرتا ہے اور اسے زبان و ادب کے جائزے میں ایک مستند حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔

ہمارا مقصد قومی زبان کا فروغ، علم کی سرحدوں کو وسیع کرنا، قومی یک جہتی میں زبان و ادب کے واسطے سے استحکام پیدا کرنا، اہلِ علم کو زبان و ادب کی ترقی سے آگاہ کرنا ہے۔ چنانچہ ہم ایسی ہر تحریر کا خیر مقدم کریں گے جو ہمارے مقاصد سے ہم آہنگ ہو۔ ہم اپنے قارئین اور اہلِ قلم دونوں سے گزارش کرتے ہیں کہ قومی زبان کو خوب سے خوب تر بنانے میں ہمارے ساتھ تعاون کریں اور قومی زبان و ادب کے فروغ میں بھرپور حصّہ لیں۔

قومی زبان (۵ اپریل ۸۶ء)

"تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ"

ایک جائزہ

صابر کلوروی

گزشتہ آٹھ دس برسوں میں اقبالیات کے میدان میں جو چند نام ابھر کر سامنے آئے ہیں ان میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس تمام عرصے میں مطالعۂ اقبال اُن کی تمام تر دلچسپیوں کا محور رہا ہے۔ تازہ ترین تصنیف اُن کی جگر کاوی اور جاں سپاری کا بے نظیر ثمرہ ہے۔

علامہ اقبال کے فکر و فن پر لکھی جانے والی کتب کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں علامہ موصوف پر لکھے جانے والے مضامین کی تعداد بلا مبالغہ نصف لاکھ سے زیادہ ہے۔ اقبال پر قلم اٹھانے والوں نے تین ذرائع سے معلومات حاصل کی ہیں:

(۱) علامہ کی تصانیفِ نظم و نثر (مطبوعہ و غیر مطبوعہ)

(۲) اُن کے مکاتیب اور بیانات

(۳) معاصر شہادتیں، ملفوظات اور ذاتی مشاہدات:

گزشتہ ۳۵، ۴۰ برسوں میں اس ضمن میں علامہ پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے اس کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم ادبی شخصیات میں جس شخصیت پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے وہ علامہ اقبال کی شخصیت ہے۔ علامہ کی اس مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ حیرت انگیز ہے کہ اس ضمن میں جس مواد کو ہم اپنے دلائل کی بنیاد بناتے ہیں اس کی پیش کش میں متعدد خامیاں موجود ہیں۔ علامہ کی جملہ تحریروں تک ہمیں رسائی حاصل نہیں ہے۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ متن کے اعتبار سے ناقص ہے۔ اور اس قابل نہیں کہ اس پر مکمل بھروسہ کیا جا سکے۔ ایسے میں کوئی محقق یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے اصل اقبال کو پا لیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں ہم نے اقبال کو جتنا سمجھنے کی کوشش کی ہے، وہ ہم سے اتنا ہی دور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہم اقبال پر عظیم الشان مواد کی فراہمی کے باوجود اُن کے ذہنی ارتقا اور افکار کے منابع تک رسائی حاصل نہیں کر سکے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کی یہ کتاب فکری اور ذہنی انتشار کی اس گرد کو صاف کرنے کی پہلی کوشش ہے۔ گو اس کا دائرہ کار

محدود ہے۔ اور یہ صرف اُن تحریروں سے بحث کرتی ہے جو علامہ کے قلم سے نکلی ہیں۔ پھر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ صحیح سمت میں پہلا قدم ہے۔

زیرِ نظر کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے دو ابواب میں علامہ کے اُردو اور فارسی کلام کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا باب مکاتیب اقبال پر ہے۔ چوتھے اور پانچویں باب میں علامہ کے دیگر نثری سرمائے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں علامہ اقبال کے ضمن میں شائع ہونے والی کتاب کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ آخری باب میں ان کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے جو علامہ نے مختلف سطح کے طلبہ کی درسی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے مرتب کی تھیں۔ ضمیمے کے طور پر علامہ کے دو اہم اور نایاب مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ آخر میں اشاریہ بھی شامل کیا گیا ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

مقالے کی ابتدا میں مصنف نے علامہ کی شاعری کا پس منظر بیان کیا ہے۔ اُن کی شعر گوئی کا آغاز اور تخلیق شعر کے محرکات کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ مقالے کے پہلے دو ابواب میں علامہ کے شعری مجموعوں کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آج ہم کلیاتِ اقبال کے جن مجموعوں پر بھروسہ کر رہے ہیں اُن میں متعدد اغلاط پائی جاتی ہیں۔ مثلاً نظم بعنوان "جاوید سے" (کلیات اقبال ص ۵۵۰) کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے: ؎

غیرت ہے طریقتِ حقیقی   غیرت سے ہے فقر کی غلامی

جبکہ اصل شعر یوں تھا: ؎   غیرت ہے طریقتِ حقیقی   غیرت سے ہے فقر کی تمامی

علامہ نے اپنے بعض شعری مجموعوں کے دوسرے ایڈیشنوں میں اضافے کیے اور بعض اشعار میں اصلاح کی۔ جس کا جاننا محققین اقبال کے لیے اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر خدشہ ہے کہ وہ اقبال سے کوئی ایسی بات منسوب نہ کر دیں جس سے وہ رجوع کر چکے تھے۔ اس حذف و اضافہ کا اندازہ اس امر سے لگایئے کہ اسرار و رموز سے پہلے مشترکہ ایڈیشن میں مجموعی طور پر سوا سو اشعار کا اضافہ کیا گیا۔ اس کتاب سے ایک انکشاف یہ بھی ہوا کہ علامہ نے بانگِ درا کے دوسرے ایڈیشن میں بعض تبدیلیاں کی تھیں۔ لیکن بعد کے کچھ ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کے متن کو ہی اختیار کیا گیا۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے مختلف ایڈیشنوں کے موازنے کے بعد جن اغلاط کی نشاندہی کی ہے اُن کی درستی کے بعد بھی یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ کیا یہ وہی کلام ہے جو علامہ نے آخری مسودے کے طور پر کاتب کو دیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پہلے ایڈیشن کی کتابت کے وقت کاتب سے بھی اغلاط سرزد ہوئیں۔ بعض غلطیوں پر تو خود علامہ کی نظر بھی نہیں گئی تھی۔ اگر کلیات کا اصل بیاضوں سے موازنہ کر کے اس طرح کی غلطیوں کی نشاندہی کر دی جاتی تو ایک بڑا کام ہوتا۔ مثلاً

ضربِ کلیم کی نظم "فقر و راہبی" کلیاتِ اقبال ص ۵۱۲ کے شعر اوّل کا یہ پہلا مصرع یوں درج ہے:

ع   کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی

جبکہ علامہ کی اصل بیاض میں لفظ "تیری" نہیں "تری" ہے۔ ضربِ کلیم کے پہلے ایڈیشن ہی سے یہ غلطی اسی طرح دہرائی جا رہی ہے:

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے ؎

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد   یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہُو

اس شعر میں اصل بیاض میں لفظ "آشفتہ مُو" ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے۔ یوسف سلیم چشتی نے آشفتہ ہو کا ترجمہ مخبوط الحواس کیا ہے

جو راقم کے نزدیک درست نہیں۔ اسی طرح "بانگِ درا" کی نظم "مسلم" [صفحہ ۱۹۵] کا ایک شعر ہے:

؎ آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات کہہ نہیں سکتے مجھے نومیدِ پیکارِ حیات

علامہ کی بیاض میں دوسرا مصرع یوں درج ہے ع کر نہیں سکتے مجھے نومیدِ پیکارِ حیات

"بانگِ درا" کی ایک اور نظم ...... کی گود میں بلی دیکھ کر (ص ۱۱۷)

مارتی ہے انھیں پونچھوں سے، عجب ناز ہے یہ چڑھ ہے یا غصہ ہے؟ یا پیار کا انداز ہے یہ

بیاض میں دوسرا مصرع یوں لکھا ہے ع چھیڑ ہے غصہ ہے یا پیار کا انداز ہے یہ

واضح ہو کہ علامہ کی بیاض میں اس شعر کے دو متن ملتے ہیں۔ ایک ابتدائی شکل دوسرا اصلاح شدہ، دونوں میں یہ لفظ چھیڑ ہی لکھا ہے۔

زیرِ نظر مقالے کا تیسرا باب مکاتیبِ اقبال کے جائزے پر مشتمل ہے جس میں نہ صرف مکاتیبِ اقبال کے مجموعے کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بلکہ نئے مکاتیب کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس موضوع پر مصنف اپنی کتاب "خطوطِ اقبال" کے دیباچے میں موضوع کا حق ادا کر چکے ہیں۔ ہمیں ان کی اس رائے سے مکمل اتفاق ہے کہ یہ مجموعے تدوینِ نو کے متقاضی ہیں۔ کیوں کہ ان مکاتیب میں نقل اور کتابت کی بے احتیاطیوں کے طفیل متعدد خامیاں موجود ہیں۔ بعض خطوط کچھ مصلحتوں کی بنا پر مکمل شائع نہیں ہو سکے۔ بعض خطوط کی تاریخیں صحیح درج نہیں کی گئیں۔ جو متعدد مغالطوں کا باعث بنی رہیں۔ اس کی ایک مثال علامہ کے "سر" کے خطاب پانے کا واقعہ ہے۔ علامہ کو یہ خطاب یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو دیا گیا تھا۔ جنوری ۱۹۲۳ء کے دو خطوں اور اپریل ۱۹۲۳ء کے ایک خط میں علامہ اقبال نے اس اعزاز کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن غلطی سے سنہ ۱۹۲۲ء درج کر دیا ہے جس کی وجہ سے بعض حضرات نے لکھا ہے کہ علامہ کو ۱۹۲۲ء میں "سر" کا خطاب دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے اس طرح کی خامیاں بڑے مغالطوں کا باعث بن سکتی ہیں۔ مصنف نے نہ صرف ایک جامع کلیاتِ اقبال کی ضرورت کا احساس دلایا ہے بلکہ اس کا ایک ناقابلِ عمل منصوبہ بھی ایک خاکے کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ اب یہ اقبال اکیڈمی کا فرض ہے کہ وہ اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے (ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی سربراہی میں اس منصوبے کا ڈول ڈالا گیا تھا۔ لیکن ان کے چلے جانے کے بعد اب یہ منصوبہ سرد خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ اور مستقبل قریب میں بھی اس تکمیل کے کوئی آثار نظر نہیں آتے)

مکاتیبِ اقبال سے قطع نظر علامہ کے مضامینِ نثر اور دیگر تحریریں زیادہ بے توجہی کا شکار ہوئیں۔ ان کی تدوینِ نو کے ضمن میں نجی یا سرکاری سطح پر کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی ہے۔ حالانکہ اقبال کی شاعری کی تشریح میں ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ افسوسناک امر یہ بھی ہے کہ ان کتب میں سے زیادہ تر کمیاب ہی نہیں نایاب بھی ہیں۔

اقبال کی نثری تحریروں میں "علم الاقتصاد"، پی ایچ ڈی کا مقالہ THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA۔ ان کے لیکچروں کا مجموعہ RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM تو مستقل اہمیت کی کتابیں ہیں۔ علامہ کے متفرق مضامین "مضامینِ اقبال" اور مقالاتِ اقبال میں جمع کیے گئے ہیں۔ انگریزی مقالات THOUGHTS & REFLECTIONS OF IQBAL اور SPEACHES, WRITINGS & STATEMENTS OF IQBAL میں موجود ہیں۔ جب کہ رحیم بخش شاہین کی مرتب کردہ کتاب MOMENTUS OF IQBAL میں بھی قابلِ قدر مواد موجود ہے۔ علامہ کے اخباری

بیانات "گفتار اقبال" (مرتبہ رفیق افضل) میں شامل ہیں۔ علامہ کی ۱۹۱۵ء کی مرتّب کردہ ڈائری بھی STRAY REFLECTIONS کے نام سے چھپ چکی ہے۔

ان کتابوں میں نقل در نقل اور کتابت کی افسوس ناک غلطیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ادھر کچھ عرصہ سے علامہ کے فکر و فن کا جائزہ لینے کے لیے اُن کتابوں کے مواد سے بکثرت استفادہ کیا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ صرف ان کتابوں کو نئے سرے سے مرتّب کر کے شائع کیا جائے بلکہ اس ضمن میں مابعد دریافتوں کو بھی ایک مجموعہ کی شکل میں سامنے لایا جائے۔ علامہ کے ذہنی ارتقا کی مختلف کڑیاں اس کے بغیر ادھوری ہی رہیں گی۔ اقبالیات کے نامکمل ذخیرے کی روشنی میں جو بات کی جائے گی اسے سند کا درجہ حاصل نہیں ہوگا۔ اس ضمن میں ایک مثال کافی ہوگی۔

اوائل عمر میں علامہ کی قادیانیت سے دلچسپی اور آخری عمر میں اس کے خلاف دشمنی کسی تحقیق کی محتاج نہیں۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۹۴ء کو سیالکوٹ کے ایک مولوی سعد اللہ لدھیانوی نے بانی احمدیت کے خلاف ایک سخت مضمون شائع کیا۔ علامہ شیخ محمد اقبال نے جوان ایّام میں سکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں ایف اے کے طالب علم تھے، مولوی سعد اللہ کا جواب لکھا۔ ۲۱ اشعار کی اس نظم سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ یہ نظم علامہ کے متداول کلام کے کسی مجموعے میں شامل نہیں اور نہ ہی باقیاتِ کلام اقبال کے کسی مجموعے میں یہ شامل ہو سکی ہے۔

واہ سعدی دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی — خوب ہوگی مہتروں میں قدر دانی آپ کی
آپ کے اشعار موتی ہیں مگر "ی" کے بغیر — گوشِ عالم تک یہ پہنچے ہیں زبانی آپ کی
آفتابِ صدق کی گرمی سے گھبراؤ نہیں — حضرتِ شیطاں کریں گے سائبانی آپ کی
قوم عیسائی کے بھائی بن گئے پگڑی بدل — واہ کیا اسلام پر ہے مہربانی آپ کی

یہ تو زمانہ طالب علمی کی نظم ہے جس میں مرزا صاحب کو "آفتابِ صدق" کہا گیا۔ اس کے بہت بعد ۱۹۱۰ء میں جب علامہ نے علی گڑھ کے سٹریچی ہال میں خطبہ دیا تو اس میں یہ الفاظ بھی شامل تھے۔

"میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر ذات نے ڈالا ہے۔ ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس نمونہ کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھیں۔ پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔" (ملّتِ بیضا پر عمرانی نظر) اس خطبے کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا۔ علامہ کا اصل انگریزی خطبہ ضائع ہو گیا۔ خود علامہ کے پاس بھی اس خطبے کی کوئی نقل موجود نہیں تھی۔ غالباً ۱۹۳۵ء میں انھیں اس کی ایک نقل مل گئی۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اس خطبے کو علامہ کے کاغذات میں تلاش کر کے اپنی موجودہ کتاب میں شائع کرا دیا۔ اس خطبے کے متعلق جس بات کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس خطبے پر علامہ کے انگریزی میں لکھے ہوئے یہ REMARKS درج ہیں۔

This lecture was delivered at Aligarh in 1911. The remark about the Qadianis in this lecture must be revised in the light of the revelation of the spirit of the movement since 1911. The Qadianis still appear to be Muslims in externals. Indeed they are very particular in the matter of externals but the spirit of the movement

as revealed often is wholly inimical to Islam. Outwardly they look Muslims and anxious to look so, but inwardly their whole mentality is Magian. It is probable that eventually the movement will end in Bahaism from which it originally appears to have received inspiration.

اب اگر جس شخص کے سامنے علامہ کا ۱۹۳۵ء کا تحریر کردہ یہ شذرہ نہیں ہوگا تو وہ ممکن ہے علامہ کے نظم اور علی گڑھ والے خطبے سے غلط نتائج اخذ کرے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نثر نگاری کبھی بھی علامہ کا پسندیدہ مشغلہ نہیں رہا۔ تاہم اس ضمن میں مجھے مصنف کے اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کہ اقبال کی نثر، اُن کے شعری آثار کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے (ص ۲۸۱) علامہ کے شعری آثار کے علاوہ علامہ کی جتنی نثری تحریریں ہمیں ملتی ہیں، وہ تمام کی تمام اس نقطۂ نظر سے تحریر ہی نہیں کی گئیں کہ علامہ کو اپنے نظریات کا اظہار یا وضاحت مقصود تھی۔ تاہم یہ نثر جس شکل میں بھی ہمیں ملتی ہے۔ اس سے علامہ کے ان نظریات کی وضاحت ضرور ہوتی ہے جو شاعری کی جکڑ بندیوں کے طفیل تشریح طلب ہی رہے۔ شعر کی تاویل کی جاسکتی ہے لیکن نثر بالعموم اپنی بے لاگ سچائی کی وجہ سے کسی تاویل کی محتاج نہیں ہوتی۔ شاعری اپنے تسکار کو گھیرے میں لینے کی صلاحیت تو ضرور رکھتی ہے لیکن اسے گرفتار نہیں کر سکتی۔ شعر جذبات کو چھوتا ہوا نکل جاتا ہے جب کہ نثر قلبِ معانی میں اُترتی چلی جاتی ہے۔

علامہ کی نثری تحریروں میں ادبی خوبیوں کی تلاش بے معنی ہے۔ اس لیے کہ یہ تحریریں اس مقصد کے لیے لکھی ہی نہیں گئیں۔ تصوف پر علامہ کے ہاں متعدد اشعار مل جاتے ہیں۔ لیکن جتنی وضاحت ان کی نثر میں ملتی ہے اتنی ان کی شاعری میں نہیں ملتی۔ اسی لیے تو علامہ اقبال کو حافظ کی شاعری کے ضمن میں خواجہ حسن نظامی کے اعتراضات اور شکوک و شبہات کے ازالے کے لیے نثر کا سہارا لینا پڑا تھا۔ "اسرارِ خودی" اور "پیامِ مشرق" کے دیباچے بھی اسی مجبوری کی بنا پر تحریر کیے گئے تھے۔ الغرض اقبال کے نثری افکار ان کے شعری آثار سے کسی طرح بھی کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ تفہیمِ اقبال میں نثرِ اقبال کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی ان کی شاعری کی۔

زیرِ نظر کتاب "ملفوظاتِ اقبال" کے لیے ایک الگ باب مخصوص کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں سید نذیر نیازی کے مرتبہ مجموعے "اقبال کے حضور"، محمود نظامی کے مرتبہ مجموعے "ملفوظاتِ اقبال" اور خواجہ عبدالحمید کی ذاتی یادداشتوں پر مشتمل مجموعے "اقبال کے چند جواہر ریزے" اور "روزگارِ فقیر" کا ذکر کیا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ اس ضمن میں ایک اہم کتاب "اقبال کے ہم صفیر" کیسے نظر انداز ہوگئی۔ ایم ایس ناز کی مرتب کردہ یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں شائع ہو چکی تھی۔ اس کتاب کے بعض مضامین تو وہی ہیں جو "ملفوظاتِ اقبال" مرتبہ محمود نظامی میں شامل ہیں۔ لیکن زیادہ تر مضامین نہ صرف نئے ہیں، بلکہ مواد کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ اُن کا مطالعہ کیا جائے۔ مولانا محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، حکیم احمد شجاع، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، راجہ حسن اختر اور خلیفہ عبدالحکیم کے مضامین بہ طورِ خاص اہم ہیں۔ ان کتب کے علاوہ متعدد حضرات نے اقبال سے اپنی ملاقاتوں کی یادداشتیں قلم بند کی ہیں جو اخبارات و رسائل میں بکھری پڑی ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اُن کی تعداد ۱۵۰ سے کم نہیں۔ اس ضمن میں چراغ حسن حسرت کے مرتبہ مجموعہ "اقبال نامہ"، مصباح الحق صدیقی کی مرتب کردہ کتاب "اقبال اپنوں کی نظر میں" بھی خاصی

اہمیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی کتاب "روایاتِ اقبال" اس سلسلے کی تازہ کڑی ہے۔ رحیم بخش شاہین کی مرتّب کردہ کتاب "اوراقِ گم گشتہ" میں بھی بعض مضامین بے حد اہم ہیں۔ محولہ بالا کتب میں شامل مضامین کے راویوں کی تعداد ۹۰ کے لگ بھگ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے ہمیں سو فی صد اتفاق ہے کہ علامہ کے ارشادو فرمودات کے اس منتشر ذخیرے سے بھرپور استفادے کے لیے موضوعاتی اشاریہ تیار کیا جائے۔ لیکن یہ کام اسی وقت مفید ہوگا جب اس طرح کی تمام منتشر تحریریں کتابی شکل میں سامنے آجائیں۔

اس تحقیقی مقالے میں ایک باب علامہ کی مرتّب کردہ درسی کتابوں کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے اپنے استعفیٰ کے بعد وہ مختصر سے عرصہ (۱۷ مئی ۱۹۰۹ تا ۱۳ دسمبر ۱۹۱۰ء) کے علاوہ درس و تدریس سے عملاً الگ رہے لیکن پرچے بنانے، کورس تجاویز کرنے، نمبر لگانے اور ضروری درسی کتب مرتّب کرنے میں اپنی وفات تک سرگرمِ عمل رہے۔ علامہ کی مرتّب کردہ درسی کتابوں میں پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے لیے مرتّب اردو کورس کے علاوہ میٹرک کے طلبہ کے لیے آئینۂ عجم کی ترتیب اور انتخاب میں بھی علامہ کا عمل دخل رہا۔ علامہ کی مرتّب کردہ کتابوں میں ایک کتاب "تاریخ ہند" بھی تھی جو ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی۔ ان کتابوں کے لیے مواد دیگر ذرائع سے حاصل کیا گیا تھا۔ تاہم کتابوں کے دیباچے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اگرچہ بعض دیباچوں کے بارے میں بجا طور پر اس شک کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ حکیم احمد شجاع کے تحریر کردہ ہیں

تصانیفِ اقبال، میں درسی کتابوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کے پیشِ نظر یہ بات مناسب ہوتی اگر علامہ کی موعودہ اور نامکمل تصانیف کا بھی مختصراً ذکر کر دیا جاتا۔ اس طرح کتابوں میں علامہ کی ایک نامکمل کتاب "تاریخ تصوّف" کا ذکر میں خاص طور پر کروں گا۔ علامہ نے ۱۹۱۵ء میں اس موضوع پر کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن کام جنوری ۱۹۱۶ء میں شروع ہوا۔ یہ کتاب دو تین ابواب سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ مواد کی کمی اس کام کی تکمیل میں رکاوٹ بنی۔ بہرحال اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر علامہ اس کتاب کو مکمل کر لیتے تو یہ کتاب RECONSTRUCTION سے کسی طرح بھی کم اہمیت کی حامل نہ ہوتی۔ بہتر گا اس کتاب کے پہلے باب سے ایک اقتباس:

> "مسلمانوں کی مذہبی رواداری کی وجہ سے اسلامی دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں ہر قسم کی غیر اسلامی مذہبی تحریکیں نشوونما پاتی تھیں۔ اسلامی فرقوں کے مباحث کے علاوہ عیسائی رہبانیت، مانویت اور سمنائیت (بدھمت) [کا] بازار بھی بصرے میں کچھ کم گرم نہ تھا۔ اور بعض لوگ جو بہ ظاہر مسلمان تھے اپنے آپ کو ثنویت کا قائل بتاتے تھے۔ الندیم نے فہرست میں مسلمان زندیقیوں کی ایک فہرست دی ہے جس سے اس زمانے کی مذہبی حرّیت کا پتہ چلتا ہے۔ اسلامی تصوّف نے بھی اسی آب و ہوا میں پرورش پائی اور جب ہم تصوّف کے بعض پہلوؤں کی تفصیلات دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریک اس کے ارتقا پر ضرور موثر ہوئی ہے۔ مثلاً تصوّف کا مسئلہ مقامات اور تسبیح کا استعمال۔ سمنائیت کے مسائل اور دستور العمل سے مشابہت رکھتا ہے۔ اوائل صوفیہ اور عیسائی راہبوں کے لباس میں بھی مماثلت ہے اور رگِ کیماس کو پاؤں کی انگلیوں میں پکڑ کر ایک خاص طریق پر بیٹھنا اور ضرب لگانا جو ہمارے بعض صوفیا میں مروّج ہے، قطعاً غیر اسلامی ہے۔ ریاضت کے یہ ہندی طریق غالباً گیارہویں صدی میں مسلمانوں میں مروّج ہوئے۔ جب کہ البیرونی نے پتنجلی کے یوگ شاستر کا سنسکرت سے

عربی میں ترجمہ کیا اور بعض صوفیا نے غالباً اسی زمانے میں ویدانتوں کی تقلید میں یہ مذہب اختیار کر لیا کہ انسان کے جسم میں نور کے چھ مختلف [الوان] نقطے یا دائرے ہیں۔ اور صوفی کا مقصد یہ ہے کہ مُراقبے اور مجاہدے کے خاص طریقوں سے اُن نقطوں کو حرکت میں لائے اور آخر کار اُن کے اختلافِ لون میں وہ نئے رنگ روشنی کا مشاہدہ کرے جس سے ہر شے روشن ہے اور جو خود غیر مرئی ہے۔ اُن نقطوں کی حرکت اور اُن کے اَلوان کی حقیقی وحدت کے احساس سے جو جسم کے ترکیبی ذرّات کو اذکار و مشاغل کی مدد سے خاص قسم کی جنبش دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ صوفی کا تمام جسم منوّر ہو جاتا ہے۔ اور جبؔ اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خارجی نظامِ عالم میں بھی یہی نور جلوہ افروز ہے تو غیریت کا احساس کلّی طور پر فنا ہو جاتا ہے۔ غالباً انھیں باتوں سے جرمن مستشرق فان کریمر نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اسلامی تصوّف ہندی الاصل ہے۔ مگر ہماری رائے میں اسلامی تصوّف اپنے ابتدائی مرحلوں میں ہندی خیالات سے مطلق متاثر نہیں ہوا۔ یہ بات تو علم الابراق ثابت کرے گا کہ کوئی نوری نقطے جسم انسانی میں یا نہیں۔ لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی میں اور اس کے بعد بہت سے غیر اسلامی طریقِ ریاضت تصوّف میں جذب ہو گئے۔ جس کو طریقِ محمدی پر استقامت کرنے والے بزرگوں نے کبھی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔"

زیرِ بحث کتاب میں ایک اور کمی کا بھی شدّت سے احساس ہوا۔ وہ یہ کہ علاّمہ کے متروک کلام پر مشتمل مجموعوں کا ذکر نہیں کیا گیا جن کی تعداد پانچ ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کلام کو علاّمہ نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اسے کیوں علاّمہ سے منسوب کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شاعر اپنے کلام کا بہترین نقاد نہیں ہوتا۔ اپنے کلام میں اصلاح کرتے وقت یا اسے ترک کرتے وقت جو شعری معیار علاّمہ کے پیشِ نظر تھے ضروری نہیں کہ آج بھی انھیں مفید سمجھا جا سکے: اقبال جیسے شاعر کے کلام کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی تمام تحریروں کا مطالعہ کیا جائے۔ اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ علاّمہ کے متروک کلام کے مطالعے کے بغیر ہم علاّمہ اقبال کے ذہنی ارتقا کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ اپنے کلام پر اقبال کی اصلاحات کا تو یہ حال ہے کہ وہ ایک ایک مصرعے پر تین تین اور بعض اوقات چار چار دفعہ اصلاح دیتے ہیں اور پھر اُن سب اصلاحات کو یک قلم موقوف کر کے شعر کی پہلی صورت کو بحال کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے کہ ان کی اصلاح نظم یا مصرعے کو اور زیادہ خراب کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر "بانگِ درا" (ص ۱۰۴۲) کی ایک نظم "بِلادِ اسلامیہ" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ پوری نظم پڑھ لیجیے، اس کا عنوان ہرگز نہیں جچتا۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم کے تاجدار — نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
نکہتِ گُل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا — تربتِ ایوب انصاری سے آتی ہے صدا
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظّم کو ملی — جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی

اس اندازِ تخاطب کی روشنی میں نظم کا عنوان "بِلادِ اسلامیہ" کسی طرح بھی موزوں نہیں لگتا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر مدینہ کی سرزمین سے خطاب کر رہا ہے۔ علاّمہ کی بیاضوں میں اس نظم کا عنوان "مدینۃ النبیؐ" ہے جسے بانگِ درا کی اشاعت کے وقت

تبدیل کر دیا گیا۔ اس پس منظر کا علم نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس نظم کے شارح کو تشریح میں الجھن ہو گی۔ علامہ کے زبردست تنقیدی شعور کے باوجود یہ اصلاح مفید ثابت نہ ہو سکی۔

یہ بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ گزشتہ دس برسوں میں شائع ہونے والی کتابوں میں ڈاکٹر ہاشمی کی یہ کتاب سب سے زیادہ وقیع ہے۔ رائٹرز گلڈ نے اس کتاب کو انعام کا مستحق قرار دے کر کتاب نہیں بلکہ اپنے وقار میں اضافہ کیا ہے۔ میری پیش گوئی ہے کہ یہ کتاب اقبالیاتی ادب میں انقلاب پیدا کرے گی۔ محققین کو اس کی وجہ سے نئی نئی راہیں سوجھیں گی۔ علامہ کے شعری اور نثری آثار کی تلاش اور ان کی تدوین اور پھر موجودہ سرمایے کی تدوین ہو سکے گی جس سے ہم اصل اقبال کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ اقبال پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کتاب نہ صرف راہنما ثابت ہو گی بلکہ اُن کے لیے ایک مثالی تحقیقی مقالے کا کام بھی دے گی۔ اس مقالے کے نگراں ڈاکٹر وحید قریشی بھی تحسین کے مستحق ہیں کہ جن کی بے مثل راہنمائی کے طفیل اتنا اچھا مقالہ نہ صرف لکھا گیا بلکہ اسے کم از کم وقت میں زیورِ طباعت سے بھی آراستہ کیا گیا۔ اقبال اکیڈیمی نے اس گراں قدر مقالے کو چھاپ کر یقیناً اپنی کوتاہیوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔

کتابی صورت میں پہلا مبسوط جائزہ

بابائے اُردو مولوی عبدالحق

حیات اور علمی خدمات

مصنّف

شہاب الدین ثاقب

صفحات: ۲۵۶ — قیمت: ۴۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان۔ بابائے اُردو روڈ۔ کراچی ۱

اقبال یادگار۔ بھوپال

اب سے پچاس اکیاون برس پہلے علامہ اقبال بھوپال کے جس شیش محل میں قیام فرماتے تھے اس کے بالکل سامنے ایک وسیع میدان کھِرنی والا تھا۔ کھِرنی والا کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میدان کے وسط میں کھِرنی کا ایک پیڑ تھا جو اب بھی موجود ہے۔ علامہ اسی میدان میں علی الصباح ہواخوری کو نکلا کرتے تھے۔ یہ کھِرنی والا میدان اب "اقبال میدان" میں بدل گیا ہے۔ اس اقبال میدان کا سنگ بنیاد ۱۹۸۴ء میں رکھا گیا اور ۱۴ر فروری ۱۹۸۶ء کو اس کی رسمِ افتتاح ادا کی گئی۔

یہ "اقبال میدان" اپنی ایک تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں پہلی جنگ آزادی کے دوران اِس میدان میں ریاست بھوپال کی فوج نے ہندستان میں انگریزی حکومت کے خلاف حرّیت کا پرچم بلند کیا تھا۔ اِس تاریخی میدان میں بھوپال ڈیولپمنٹ اتھاریٹی نے ایک کلچرل پارک اور مانومنٹ تعمیر کیا ہے۔ پارک ۱۷۶ مربع گز کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں تقریباً دس ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ پارک کے اندرونی حصّے میں اس کی دیواروں کے ساتھ ساتھ ۲-۲ میٹر چوڑی پھولوں کی کیاریوں کا حصار کھینچا گیا ہے۔ کیاریوں میں تیرہ قسم کے ایسے پودے لگائے گئے ہیں کہ ہر موسم میں کوئی نہ کوئی کیاری اپنے دامن میں تازہ و رنگین پھولوں کو بھرے دعوتِ نگاہ و دل دیتی رہے۔

مشہور درخت کھِرنی کے آس پاس چبوترے بنا دیے گئے ہیں۔ انھیں بھی علامہ اقبال کے اشعار سے مزیّن کیا گیا ہے۔ میدان کے سرے پر ۱۸ میٹر لمبا، ۵، ۷ میٹر چوڑا اور ۸ میٹر اونچا ایک اسٹیج اور کئی خوب صورت لان تعمیر کیے گئے ہیں۔ پارک کے بیرونی اور اندرونی دیواروں اور چبوتروں پر سُرخ پتھر کے پٹّے لگائے گئے ہیں۔ علامہ اقبال کے اشعار اور "ترانۂ ہندی" کو اُردو اور دیوناگری میں کندہ کروا کے اندرونی دیواروں اور چبوتروں کو آراستہ کیا گیا ہے۔ روشنی اور آواز کا معقول انتظام۔ لوگوں کے بڑے سے بڑے مجمعے کی آمد و رفت میں کوئی خلل واقع نہ ہو اس لیے پارک میں پانچ دروازے تعمیر کیے گئے ہیں اقبال میدان کے مشرقی سرے پر اقبال یادگار کے طور پر ایک مانومنٹ ہر آنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔ اس یادگار مانومنٹ کا ڈیزائن بھارتی مصوّر جے۔ سوامی ناتھن اور مشہور مجسمہ ساز روبن ڈیوڈ کے مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ "اقبال میدان" باغ یا پارک کا نقشہ بمبئی کے مشہور لینڈ اسکیپ ماہرِ تعمیرات کشور پردھان نے بنایا ہے۔ مانومنٹ کی اونچائی تیس ۳۰ فٹ ہے۔ اس کے سرے پر قدرتی چٹان کا ایک ساڑھے تین ٹن کا ٹکڑا جما کر اس پر مختلف دھاتوں کی مدد سے

تیار کر کے علامہ اقبال کا استعاراتی پرندہ شاہین نصب کیا گیا ہے۔ اس کے پس منظر میں موتی مسجد اور چاروں طرف بوربون اسٹائل کی شاہی عمارتیں اس اقبال یادگار کو مزید وقار اور حسن بخشتی ہیں۔

مشہور مصور جے سوامی ناتھن اور مجسمہ ساز روبن ڈیوڈ نے اس مانومنٹ کو تیار کرتے وقت کن خیالات کو پیشِ نظر رکھا تھا۔ ان کو یہاں پیش کر دینا دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس سے قارئین کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ایک فن کار اپنے تخلیقی لمحوں میں کس کس طرح سوچتا ہے اور اس کو اپنے خیالات کے مطابق ڈھالنے میں کس کرب سے گزرتا ہے۔

"ہم نے سوچا کہ شاہین نہ صرف اقبال کو خراجِ عقیدت کی تمثیل ہو بلکہ انسانی فلاح سے زیادہ اپنی ہوس پرستی کی تسکین کے لیے جدید ٹکنالوجی کو استعمال کرنے والوں کے واسطے ایک سخت وارننگ ہو۔ ہم نے اس شاہین کے ذریعے روح کی بے خوفی، اندھیرے سے سمجھوتہ نہ کرنے والی انا اور مغلوب نہ ہونے والی آزادی کو پیش کیا ہے۔ یہ فیصلہ لوگوں کو کرنا ہے کہ ہم اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔"

یادگار مانومنٹ پر اقبال کے شاہین سے متعلق چار اشعار بیتل کے اردو حروف میں ڈھلوا کر چسپاں کیے گئے ہیں۔ ان میں ایک شعر بڑا حسبِ حال ہے:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

یہ اور دوسرے اشعار دیوناگری رسم الخط میں مانومنٹ کے آس پاس کی کیاریوں کی دیواروں پر بھی کندہ کرا کر نصب کروائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں اردو کی خوش نویسی کا کام دہلی کے مشہور خطاط جناب علیق ٹونکی نے کیا ہے اور دیوناگری کی خوش نویسی بھوپال کے جناب ظفر آرٹسٹ کے قلم کی مرہونِ منت ہے۔ بیتل کے حروف بھوپال کے جناب محمد فصیح نے ڈھالے اور اشعار کو کندہ کرنے کا کام جن حضرات نے خوش اسلوبی سے انجام دیا ان میں سید خورشید حسن، رادھے شیام، چاند خاں اور وجیہ الدین شامل ہیں۔

اقبال میدان کے ساتھ ہی واقع شیش محل جہاں علامہ اقبال قیام پذیر ہوتے تھے اور جہاں علامہ کی کئی لافانی نظمیں تخلیق ہوئی تھیں اب "اقبال ادبی مرکز" بن گیا ہے۔ اس ادبی مرکز کے منصوبے میں ایک اقبال لائبریری شامل ہے جس میں بیشتر کتب اقبال پر ہوں گی۔ علاوہ ازیں مہمان شعرا ادبا کے لیے قیام گاہ، خوش نویسی کے فروغ کے لیے ایک کتابت اسکول اور غیر اردو داں طبقہ کے لیے اردو سکھانے کا انتظام اس منصوبے کا ایک حصہ ہے۔

یہاں آنے والا بوربون اسٹائل کی عمارات اور موتی مسجد کے پس منظر کے ساتھ "اقبال یادگار" کا نظارہ کرتا ہے تو اس پر حیرت، استعجاب اور خوشی کے ملے جلے اثرات و کیفیات طاری ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ کیفیات جب الفاظ کی مدد سے اظہار کے قالب میں ڈھلتی ہیں تو قابلِ دید صورتیں سامنے آتی ہیں۔ انھیں آپ بھی دیکھیے۔

"خوب صورت خیال۔ اس سے بھی زیادہ خوب صورت تکمیل"

جنندر کمار۔ ہندی کے مشہور ادیب

"بھوپال شہر کے وسط میں ایک خوب صورت جگہ کو نئی زندگی ملتی دیکھ کر بے حد سکون ہوا۔ نئی تشکیل میں بلند تخیل، قدیم فنِ تعمیر کے وقار کا لحاظ اور علامہ اقبال کے فلسفے کی تشہیر کے لیے

جگہ اور رنگوں کا بہترین امتزاج ہے۔ سوامی ناتھن اور روین ڈیوڈ کی یہ شاندار تخلیق ہمارے وقت کے عظیم شاعر کا سچا خراجِ عقیدت ہے۔"

سیّد حیدر رضا، مقیم پیرس۔ اہم ترین مصوّر
اور آرٹ کے بین الاقوامی جج برائے ترنالیہ بھارت

"بھوپال ایک خوب صورت شہر ہے۔ اقبال یادگار اس شہر کی خوب صورتی میں مستقل اضافہ ہے۔ اقبال کے شعری استعارے "شاہین" کو سوامی ناتھن جیسے عظیم فن کار نے نہایت عمدگی سے سنگ و خشت کی صورت عطا کی ہے۔ جناب ممنون حسن خاں کی نگرانی میں ہی آرٹ کا یہ بے مثال نمونہ وجود میں آسکتا تھا۔"

مشفق خواجہ۔ پاکستانی ادیب و ناقد

علاّمہ اقبال کی شخصیت اور فن پر لکھی جانے والی پہلی کتاب

اقبال

مصنّفہ: احمد دین (مصنّف سرگزشت)

مرتّبہ: مشفق خواجہ

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئی تھی اور اس ایڈیشن کے تمام نسخے جلا دیے گئے تھے۔ دوسری مرتبہ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ نئے ایڈیشن میں متن ۱۹۲۶ء کے ایڈیشن پر مبنی ہے اور ۱۹۲۳ء کے ایڈیشن کے تمام حذف شدہ مباحث اور اختلافات کو کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں مرتّب نے طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں احمد دین کے حالاتِ زندگی ادبی کاموں اور علاّمہ اقبال سے تعلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے

صفحات: ۵۲۸ قیمت: ۷۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

پیر حسام الدین راشدی

عبدالسمیع خان

تقریباً پانچ ہزار سال سے علم و ادب، تاریخ و تہذیب اور ثقافت کی حامل سرزمینِ سندھ اب تک بے شمار ادباء و شعرا، مؤرخین و مصنفین، مدبّروں اور محدثوں کو جنم دے چکی ہے۔ اسی گیتی تابدار پر لفرت اسٹیشن کے قریب پیر جو گوٹھ میں ۲۰ ستمبر ۱۹۱۱ء بمطابق ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ کو پیر حسام الدین راشدی نے جنم لیا جن کا شمار اس صدی کے کثیر الفضائل فضلاً کثیر العلوم علماً اور کامل مؤرخین میں ہوتا ہے۔ پیر صاحب زبان و قلم پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو اور سندھی زبانوں کے علاوہ فارسی میں بھی خاصا ادب تخلیق کیا ہے۔ پیر صاحب کا شمار سندھ کے اُن مورخین میں ہوتا ہے جو صدیوں میں کبھی کبھار پیدا ہوتے ہیں مگر اپنی نظرِ کیمیا اثر سے خاک کو سونا اور لوہے کو کندن بنا دیتے ہیں۔ آپ کی تعلیم گو کہ کسی کالج یا یونیورسٹی کی مرہونِ منّت نہ تھی لیکن آج سندھ کا طالب علم آپ کے علم و ہنر، تصنیف و تحقیق اور تدوین و ترتیب اور آپ کی تالیفات کا محتاج ہے۔

پیر حسام الدین راشدی بنیادی طور پر تاریخ کے عالم تھے اور تاریخ ہی کے حوالے سے اُن کی نظر مختلف علوم و فنون پر تھی۔ وہ اپنی دھرتی سے کس قدر پیار اور اپنی جنم مٹی سے کس قدر محبّت کرتے تھے اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے سندھ کی قدیم ترین تاریخ و تہذیب اور سندھی ثقافت کے ان بنیادی ماخذات کو نہ صرف مرتّب و مدوّن کیا بلکہ اسے شائع کر کے سندھ کی علمی و تہذیبی، تحقیقی و تصنیفی اور تدریسی زندگی کو از سرِ نو حیات بخشی اور آج جو سندھ کی نئی نسل علمی و تحقیقی، ترتیبی و تالیفی اور تدریسی کام کر رہی ہے اس کا اکثر و بیشتر حصّہ پیر صاحب کی تصنیفات و تالیفات اور تحقیقات سے مزیّن و مرتّب اور آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے۔ پیر صاحب سرزمینِ سندھ کا وہ روشن آفتاب ہیں جنھوں نے جدید تحقیق کی روایات سے اہلِ سندھ کو روشناس کرایا اور اہلِ سندھ کو جدید اندازِ فکر اور طرزِ تحریر عطا کیا۔ اُن کی یہ خدمات تاریخِ سندھ میں روشن دلیل کے طور پر زندۂ جاوید رہیں گی بلکہ پیر صاحب کو حیاتِ جاوداں عطا کیے رہیں گی۔ پیر حسام الدین راشدی نے اپنے علمی و تحقیقی کاموں سے نہ صرف قدیم کتابوں کو نئی زندگی بخشی بلکہ قدیم ادبا و شعرا اور مورّخین و مولفین کو بھی حیاتِ نو عطا کی۔ انھوں نے مسلسل تحقیق کر کے نہ صرف اپنے آپ کو سچّا اور حقیقی، اپنی دھرتی سے اور اس کی تہذیب و تاریخ و ثقافت سے محبّت کرنے والا محقق ثابت کیا بلکہ تحقیق و تالیف کے وسیع و عریض گلستاں میں تحقیق کی صبر آزما روایت کو بھی قائم کیا ہے۔ پیر صاحب نے سندھی ادب اور تاریخِ سندھ میں جو ذخیرہ ورثہ میں چھوڑا ہے وہ اہلِ سندھ کے لیے توشۂ خاص کی حیثیت رکھتا ہے۔

پیر حسام الدین راشدی نے فارسی، اردو اور سندھی میں کم و بیش پچاس کتب تصنیف و تالیف اور مرتّب و مزیّن کی ہیں۔ سندھی ادب میں "تذکرۂ امیر خانی"، سندھ کے نامور علمی و ادبی خاندان امیر خانی سادات کے احوال پر مفصّل کتاب ہے جو راشدی صاحب کی تالیف کا نادر شاہکار ہے۔ "ماک بھنا رابیل"، ماہنامہ نئی زندگی میں راشدی کے شائع شدہ مقالات کا مجموعہ ہے۔ تاریخِ سندھ پر سندھی زبان میں پیر صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ "مکلی نامہ" کی ترتیب ہے جو اصل میں میر علی شیر قانع کی ترتیب ہے لیکن پیر صاحب نے اسے مکمل و مفصّل طور پر سندھی زبان میں مرتّب کرکے شائع کرایا ہے۔ اسی طرح تاریخِ سندھ کے امام مولانا دفائی نے مشاہیرِ سندھ کے احوال پر "تذکرہ مشاہیرِ سندھ" کے نام سے چار جلدوں میں تحریر کی تھی اور اس کا پہلا حصہ راشدی صاحب کا ایڈیٹ کردہ ہے۔ تاریخ سندھ پر پیر صاحب کی دوسری اور سب سے بڑی اور اہم کتاب "میر محمد معصوم شاہ بکھری" کی مکمل سوانح حیات ہے جس میں اس کی علمی و ادبی اور اس کی سماجی، معاشی اور معاشرتی خدمات کا ذکر پیر صاحب نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ "گاھیو کوٹھ وٹن جو" اور ٹھٹھہ کا تاریخی جغرافیہ" پیر صاحب کی تاریخی تصانیف ہیں۔ علاوہ ازیں سندھی میں سندھ کے نامور ہیرو اور رحیم تیلی "مرزا عیسیٰ خان" پر بھی مقالات تحریر کیے ہیں۔

سندھی کی طرح اردو زبان میں بھی پیر صاحب نے دقیق تحقیقی اور تالیفی کام کو آگے بڑھایا۔ اور اردو ادب کو وہ دُرِ بے بہا عطا کیے جو اپنی آب و تاب سے اردو ادب کی تاریخ کو چکا چوند کیے ہوئے ہیں۔ مرحوم پیر صاحب بابائے اردو مولوی عبدالحق کے دست راست اور انجمن ترقی اردو کراچی کے محکم ستون تھے۔ پیر صاحب اپنی اعلیٰ فراست اور فہم و تدبّر کے باعث رسالہ "اردو" کراچی کی مجلسِ ادارت میں آخری وقت تک شریک رہے اور انھیں انجمن کی انتظامیہ کا اہم رکن ہونے کا شرف بھی آخر دم تک حاصل رہا۔ اس کے علاوہ وہ پاکستان کی تقریباً ہر تحقیقی و علمی مجلس کے رکن رہے۔ ان کی بات کو ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر دورِ حکومت میں انھیں سندِ اعتراف حاصل ہوتی رہی۔ پاکستان کے ہر بڑے علمی، ادبی، تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی و مذہبی وفد میں انھوں نے شرکت کی۔

پیر حسام الدین راشدی علم صحافت، اردو ادب اور سندھی تاریخ پر گہری بصیرت اور نگاہ دور بین رکھتے تھے۔ پیر صاحب کا تعلق سندھ کے ادب و صحافت سے تھا لیکن انھیں جو مقام اور شہرتِ دوام ایک مورخ کی حیثیت سے حاصل ہوا وہ انھی کا خاصہ ہے۔ پیر صاحب کی تحقیق و ترتیب اور تصنیف و تالیف کی سب سے بڑی اور سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ جہاں صحتِ متن پر مکمل اور خصوصی توجہ دیتے تھے وہیں وہ متعلقہ موضوعات کو بھی ساتھ یکجا کر دیتے تھے اور یہ دوہری افادیت ان کی ہر کتاب کی زینت بنی نظر آتی ہے۔ اردو میں پیر صاحب نے "سندھی ادب" کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی جو اصل میں سندھی ادب کی مختصر تاریخ ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنے شائع شدہ مضامین کو "ہفت مقالہ" کے نام سے یکجا کیا جو سہ ماہی رسالہ "اردو" کراچی کی زینت بنے تھے "دو چراغ محل" اردو زبان کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب پر پیر صاحب کی اچھوتی اور ایک انوکھی تصنیف ہے جو ندرت و جدّت میں اپنی مثال آپ ہے۔ اردو ادب و تاریخ میں پیر صاحب کا سب سے بڑا شاہکار نامہ سندھ کے حاکم "مرزا غازی بیگ ترخان" کی سوانح اور ادبی بزم پر ان کی مفصّل اور مدلّل تالیف ہے۔ یہ کتاب سندھ کی تاریخ کے کئی عظیم راز اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے۔ پیر صاحب نے اسے "مرزا غازی بیگ ترخان اور ان کی بزم ادب" کے نام سے تالیف کیا ہے اس کے علاوہ مولانا محب علی سندھی پر بھی پیر صاحب نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جو اپنے اسالیب کے لحاظ سے ایک جدید طرز ایجاد ہے۔

پیر صاحب جہاں ایک تاریخ داں کی حیثیت سے قرطاسِ تاریخ پر دمکتے نظر آتے ہیں وہیں انھوں نے صحافتی میدان میں بھی کارہائے

گراں انجام دیے ہیں۔ پیر صاحب کی صحافتی زندگی بہت مختصر اور تھوڑے عرصے پر محیط ہے لیکن اس مختصر عرصے میں بھی انھوں نے اس فن کو اس نازک وقت میں سنبھالا دیا جب کہ فنِ صحافت اپنی اقدار کو کھو چکا تھا۔ اور روبہ زوال تھا۔ اس وقت انھوں نے "الراشد" کے ذریعے اس فن کی اور اہلِ سندھ کی جو خدمت کی وہ سب پر مثلِ شمع عیاں ہے۔ اس کے علاوہ "سندھ زمیندار" اور "ستارۂ سندھ" کے ذریعے پیر صاحب نے جو قابلِ قدر کارنامے انجام دئے ہیں وہ تاریخِ صحافت اور سندھ کی تاریخ و ادب میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔

پیر صاحب ان تمام علمی و تحقیقی مشاغل کے باوجود مجلسی زندگی کے لیے وقت نکالتے تھے وہ ایک اچھے انسان اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی قربت میں رہ کر آدمی خوش دل ہوتا تھا۔ اور وسیع النظری و وسیع القلبی کے قرینے سیکھتا تھا۔ کام کے وقت کام اور بات کے وقت بات آپ کا اصول تھا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے بے شمار قومی و اجتماعی مشاغل کے باوجود کثیر علمی و دقیق تحقیقی اور تصنیفی و تالیفی کام کیا ہے۔ یہ وسیع علمی و تحقیقی کام اس بات کا ثبوت ہے کہ اُن کو سلیقہ حیات اور اصولِ حیات کے فن سے کاملاً واقفیت تھی۔ پیر صاحب قدیم تہذیب کے دلدادہ تھے لیکن جدید علوم کے پرستار بھی تھے۔ پیر صاحب ہمہ فن شخصیت، کمال کا مجموعہ، تعلقات و وضعداری کے پروردہ تھے لیکن افسوس کے یکم اپریل ۱۹۸۲ء کو یہ عظیم شخصیت اور تاریخِ سندھ کا تابندہ ستارہ جہان افق سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا لیکن تسکین غم زدگان کے لیے بیش بہا ذخیرۂ علمی و تحقیقی ورثہ میں چھوڑ گیا۔

سندھی اور اردو کی طرح پیر صاحب نے فارسی ادب پر بھی گراں احسان یادگار چھوڑا ہے۔ گو کہ پیر صاحب سندھی ادب و تاریخ کے شہ سوار ہیں اور اس میں کم و بیش تین سو مقالات تحریر کیے جب کہ سندھی ادب کی تصنیفات و تالیفات علحدہ ہیں۔ مگر اردو کے بعد فارسی ادب پر بھی ان کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے اس زبان کے اہلِ تشنگان کو بھی دریا مہیا کیا ہے۔ اردو، سندھی اور فارسی ادب و تاریخ کا یہ گراں قدر سرمایہ پیر صاحب کی مجاہدانہ زندگی کی ۷۱ سالہ مسلسل جدوجہد، شبانہ روز کا نتیجہ ہے۔ فارسی ادب میں پیر صاحب کی "چینسر نامہ"، "مثنوی مظہر الآثار"، "مکلی نامہ"، "مثنویات و قصائد قانع ٹھٹوی" اور "تذکرۂ شعراء کشمیر" خاص مقام رکھتی ہیں۔ اسی طرح تاریخ پر "تاریخ مظہر شاہجہانی"، "تاریخ ترخان نامہ"، "تذکرہ روضۃ السلاطین" اور "جوہر الحجائب" وغیرہ ہیں۔ فارسی ادب میں پیر صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ "مثنوی مہر و ماہ" اور "ہشت بہشت" کی ترتیب و تدوین اور اس کی اشاعت ہے۔ جب کہ تاریخ میں جو کام انھیں حیاتِ جاودانی بخشے ہوئے ہے وہ سندھ کی تاریخ پر مفصل و مدلل اور مکمل کتاب "تحفۃ الکرام" کی جدید تکمیل اور اس کی اشاعت ہے۔ اس کے علاوہ پیر صاحب کے تذکرے بھی کافی شہرت رکھتے ہیں۔ مثلاً "تذکرۂ مشائخ سیوستان"، "حدیقۃ الاولیاء" اور "تذکرۂ ریاض العارفین"۔

اُردو ادب کی تحریکیں

مصنف: ڈاکٹر انور سدید

صفحات: ۷۰۲۔ قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان بابائے اُردو روڈ۔ کراچی ۱

منشی محمد سعید کامٹوی

(۱۸۶۰ — ۱۹۳۰)

حکیم اسرار احمد کریوی

ناگپور سے کوئی دس میل دُور کامٹی ایک چھوٹا سا شہر ہے جو اردو زبان و ادب کے مرکز کی حیثیت سے خاصا مشہور ہے۔ اسی شہر میں محمد سعید کامٹوی مرحوم کے والد محمد عبداللہ، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دو سال بعد مئو ناتھ بھنجن (ضلع اعظم گڑھ) سے نقل مکانی کر کے آبسے تھے ایک سال بعد ۱۸۶۰ء میں محمد سعید کی پیدائش اسی شہر میں ہوئی۔

محمد عبداللہ کا شمار کامٹی کے کاروباری اور متمول گھرانوں میں ہوتا تھا۔ آپ شہر کے تعلیمی اور سماجی کاموں میں بھرپور شرکت کرتے تھے انھیں خدمات کی وجہ سے آپ کنٹونمنٹ بورڈ کے ممبر نامزد ہوئے جو اُس وقت کا ایک بڑا شہری اعزاز تھا۔ جب ۱۹۲۷ء میں کامٹی کو میونسپلٹی کا درجہ ملا تو آپ اس کے بھی ممبر منتخب ہوئے۔

منشی محمد سعید اُردو کے ساتھ ہی ساتھ فارسی اور عربی زبانوں پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ آپ زہد و تقویٰ کے بھی پابند تھے اور سلسلۂ طریقت میں مولانا شاہ عشرت بدخشانی رح (ف۔ ۳ صفر ۱۳۲۸ھ بمطابق ۱۹۱۰ء) کے مُرید تھے۔ آپ کاروبار کے سلسلے میں بمبئی آتے جاتے رہتے تھے۔ اور یہیں سعید مرحوم کی ملاقات حاجی سید تجمل حسین جلال پوری سے ہوئی جو بمبئی کے مطبع کریمی میں ملازم تھے۔ آپ طرح دار سخن ور تھے۔ حضرت تجمل سے اصلاح لینے لگے جو حافظ نثار احمد خاں تائب شاہجہانپوری کے شاگرد تھے۔

سعید مرحوم معاشی فکر و اندیشہ سے بڑی حد تک فارغ البال تھے۔ وقت گزاری اور تفریحِ طبع کے لیے شعر گوئی کرتے تھے۔ جس کی ابتدا آپ نے اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی کر دی تھی۔ ابتدائی شاعری صرف نعت تک محدود تھی۔ یہ اُن کے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ اُن کی شاعری عشقِ رسولؐ کے جذبات سے معمور تھی جو اُن کے مُرشد مولانا شاہ عشرت بدخشانیؒ کے روحانی فیض کا نتیجہ تھا۔

سعید مرحوم کے نعتیہ اشعار کا پہلا مجموعہ فروغِ جاوید عرف نعتِ سعید ۱۸۹۳ء میں آپ کے استادِ گرامی تجمل جلال پوری نے بمبئی کے مطبع کریمی سے خود طبع کرایا تھا۔ جناب غلام محی الدین صاحب بیدار رام پوری "نعتِ سعید" کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"حسن شاہد طبع جناب منشی محمد سعید صاحب سعید خداداد ہے۔ .... جس دیوان میں ۹۲ قصیدے ہم عدد اسم ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوں پھر کس طرح مطبوع دل ہائے خلائق نہو۔ خدا نے

کیا اچھی طبیعت بخشی ہے۔ مضامین عالی زبان شستہ، مضمون چست، خیالات پختہ۔ سچ یوں ہے کہ نہ اُدھر سے لاف نہ اِدھر سے گزاف" (نعت سعید۔ ص ۵۱)

سعید مرحوم خود اپنے مقدمہ ارمغانِ جدید عرف دیوانِ سعید (مطبوعہ مطبع انوار محمدی، لکھنؤ ۱۸۹۶ء) میں لکھتے ہیں (ص۔۴)

"میرا دیوان در نعت نبی آخر الزماں موسومہ بہ اسم تاریخی فروغ جاوید عرف نعتِ سعید طبع ہو کر شائع ہوا اور عاشقان حسنِ احمدیؐ و ذاکرانِ ذکر محمدیؐ میں مقبول طبایع ہوا۔ اکثر احباب نے غزلیاتِ عاشقانہ کی فرمائش اور خواہش کی اور ایسا ولولہ اور جوش دلِ عقیدت منزل میں پیدا کر دیا جس سے مجھے کوئی چارہ معلوم نہ ہوا۔ آخرش اُن کے حکم کی تعمیل واجب ہوئی۔ طبیعت رنگِ عاشقانہ پر غالب ہوئی۔ شوقِ غزل گوئی روز بروز ترقی پذیر ہوا"

یوں نعتِ سعید کے تین سال بعد ہی غزلوں کا مجموعہ بھی شائع ہو گیا جس میں ۱۶۵ غزلیں ایک تضمین اور ایک خمسہ بھی شامل ہے۔

مولانا ناطق گلاوٹھوی (متوفی ۱۹۶۹ء) کبھی ناگپور میں قیام کرتے تھے اور منشی محمد سعید مرحوم ان کے ہم عصر تھے۔ مولانا ظہیر وانٹی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اپنے اپنے حلقوں میں دونوں کو استادانہ مرتبہ حاصل تھا۔۔۔۔۔ ایک طرف ناطق اور اُن کے شاگردوں کی جماعت تھی دوسری طرف سعیدی گروہ تھا۔ معاصرانہ چشمک البتہ کبھی کبھی دونوں گروہوں میں ہنس ہوئی بلکہ دونوں خلوص و محبّت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ یگانگت کا یہ رشتہ پوری عمر نبھا اور خوب نبھا۔ اس تعلق خاطر کا نتیجہ یہ ہوا کہ کامٹی اور ناگپور میں اردو مشاعروں کا اتنا عروج ہوا کہ اس کی شہرت دُور دُور پھیل گئی۔ اور آج بھی گونڈوانے کا یہ علاقہ شعر و ادب میں پیچھے نہیں ہے۔ سعید مرحوم کے استاد تجمل جلال پوری مرحوم سے مولانا ناطق مرحوم کے بھی عزیزانہ مراسم تھے۔ جب وہ ۱۹۱۰ء میں کامٹی سے تشریف لائے تو اپنے ایک شعر میں اس کا برملا اظہار یوں کیا۔

یاد آتے ہیں تجمّلؔ احباب کامٹی کے
ناطقؔ سعیدؔ اخگرؔ، صوفیؔ، مجیدؔ، اخترؔ

ارمغان جدید کی غزلوں کے سرسری مطالعہ سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ سعید مرحوم شاعری کے اس مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ جس میں محبوب کے ظاہری لوازم حُسن و جمال، زلف، ابرو، خال و خد، چاہ زقن وغیرہ اور اس کے لوازم سرمہ، مِسّی، مہندی اور چوٹی وغیرہ کا بیان شد و مد سے کیا جاتا ہے۔ غزل گوئی کا یہ خارجی رنگ ابتداً تو دہلی اور لکھنؤ میں یکساں رائج تھا لیکن بعد میں یہ بڑی حد تک لکھنؤ سے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ سعید مرحوم کے استاد جناب تجمل جلال پوری اور اُن کے استاد جناب ثاقب شاہجہانپوری غالباً لکھنؤ کے اس خارجی شاعری کے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے جس کا سب سے بڑا ثبوت سعید مرحوم کا دیوان ارمغانِ جدید ہے۔ سارے دیوان میں لکھنؤ کی خارجی شاعری کے مدرسۂ فکر کی گلکاریاں نظر آتی ہیں۔ اور شعر گوئی کا سارا زور دُرِ دنداں، زلف و ابرو، خد و خال، رخسار اور حنائی انگلیوں اور اُن کے لوازم پر صرف کیا گیا ہے۔ اس معاملے میں سعید مرحوم بڑی حد تک مجبور تھے کیوں کہ ان کی شعر گوئی نے جس فضا میں آنکھ کھولی اور جن استادوں سے ان کی شاگردی کا سلسلہ قائم ہوا وہ سب اسی خارجی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

ایک بات اور قابلِ توجہ ہے کہ دیوانِ سعید کی اشاعت ۱۸۹۶ء میں ہوئی تھی جب سعید مرحوم کی عمر خود ۳۶ سال کی تھی۔ اس کے بعد ۱۸۹۷ء سے اپریل ۱۹۳۰ء تک کا اُن کا کلام "جلوۂ یار"، (میرٹھ) "پیامِ یار" (لکھنؤ) "سفینۂ نجات" (دہلی) اور دیگر گلدستوں اور ماہناموں میں بکھرا ہوا ہے۔ اُس دور کی شاعری میں پختگی اور استادانہ رنگ نمایاں ہے۔ راجہ راجیشور راؤ اصغر کے "نغمۂ عنادل" میں (مرتبہ ۱۹۱۰ء / مطبوعہ ۱۹۳۶ء، مطبع نظام دکن واعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد دکن) جس میں ۴۰۰ سے زائد متقدمین اور متاخرین کے کلام کا انتخاب شامل ہے، کم و بیش ۱۷۵ اشعار سعید مرحوم کے بھی شامل کیے گئے ہیں۔

میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک ناگپور میں استاد اور طبیب کی حیثیت سے مقیم رہا اور یہیں میرے تعلقات سعید مرحوم کے فرزند محمد خورشید حق مرحوم (۱۹۰۳ء - ۱۹۶۳ء) سے قائم ہوئے جو میرے ناگپور کے قیام کے دوران بڑے خلوص و محبت سے برقرار رہے۔ کچھ دنوں پہلے خورشید مرحوم کے فرزند پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید جامعہ کراچی میں شعبۂ علم کتب خانہ و اطلاعات کے سربراہ ہیں۔ مجھ سے فرمائش کی کہ میں اُن کے دادا جان مرحوم کے مطبوعہ دیوان کا انتخاب کروں۔ ڈاکٹر انیس خورشید نے اس نسخہ کے ساتھ ہی اپنے دادا مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام کا بھی ایک حصہ مع اُن کی بیاض فراہم کیا۔ چنانچہ اب جو مجموعہ انتخابِ کلام سعید کے نام سے ۱۹۸۵ء میں چھپا ہے، سعید مرحوم کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب ہے۔ غیر مطبوعہ کلام کی مناسب نشاندہی انتخاب میں موجود ہے۔

اس انتخاب کے سلسلے میں شاعر کے رنگِ سخن کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور کوشش کی گئی ہے کہ ان کے اندازِ کلام کو بعینہٖ پیش کیا جائے۔ قطع نظر اس کے کہ سعید مرحوم کا درجہ غزل میں کیا ہے اور اُن کے ہم عصر شعرا میں اُن کو کیا مقام حاصل تھا، "انتخابِ کلامِ سعید" کی ایک تاریخی حیثیت بھی ہے کہ اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے اردو کو صوبہ متوسط و برار میں کیا حیثیت حاصل تھی خاص طور پر اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ یہ صوبہ جسے گونڈ والے کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اردو کے مراکز، دہلی اور لکھنؤ اور دکن سے الگ تھلگ گھنے جنگلوں اور دشوار گزار چھوٹی بڑی پہاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سریرام کے اردو شاعروں کے مبسوط تذکرے "خم خانۂ جاوید" میں سعید مرحوم اور اُن کے استاد تجمّل جلال پوری کا ذکر اور ساتھ ہی اُن کے کچھ اشعار کا انتخاب بھی شامل ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ سعید مرحوم لکھنؤ کے رنگ اور طرزِ شاعری سے متاثر تھے "ارمغانِ جدید" کی ابتدا میں تین صفحوں پر مشتمل نثر میں جو ایک مختصر سا دیباچہ ہے، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے سعید مرحوم نہ صرف شعر میں بلکہ نثر میں بھی لکھنؤ طرزِ نگارش کے سچے پیرو تھے۔ ذیل میں اس دیباچے سے چند سطروں کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ یہ تحریر مرزا رجب علی بیگ سرور کے "فسانۂ عجائب" سے کتنی مطابقت رکھتی ہے۔

"پیشکشی عروضِ محامدت کی ایسی بحرِ ذخارِ قدرت و صنعت کے واسطے کہ جس نے ایک ترانہ موزوں کُن سے نظمِ خلقت کو کامل کیا اور ہم وزن آوازہ دو حرفی کے ایک ایسے بسیط صنائع و بدائع عالم موجودات سے کہ جو ایجادِ جدید و وافر ترقیات کا منبع ہے تقارب دیا اور اپنے فیض و تصرّف میں بلا قید و تاکیدِ دیگر کے لے لیا جس سے ہر ایک فرعونی و نمرودی خیال اپنی عقل آرائی سے دنگ ہوا اور جب ہم ردیف ہوئے مضمون مرادف سے قافیہ تنگ تو جامِ اطاعت عجز کے چشمہ سے بھر کر پیا۔"

نثر میں لفظی بازی گری کا جو طلسم اس مضمون میں باندھا گیا ہے، سعید مرحوم کا کلام کم و بیش اُس کا آئینہ دار ہے۔

جیسا کہ اردو کے مروجہ اور مطبوعہ دیوانوں کی ابتدا اور ترتیب ہوتی ہے اسی طرح "ارمغانِ جدید" میں اسی تسلیم شدہ روایت اور دستور کے مطابق دیوان کا آغاز خداوند عالم کی حمد و ثنا سے ہوتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

جھونکا چلے جو تیری نسیمِ بہار کا　　غنچہ ابھی کھلے دلِ امیدوار کا

ذیل کا شعر زبان کی سادگی، صفائی اور خوبیٔ ادا کی اچھی مثال ہے۔

ہم غریبوں کا خبر گیر و مددگار و معین　　فضل تیرا ہے، کرم تیرا ہے احساں تیرا

کامٹی کی آبادی کی اکثریت سنّی مسلمانوں پر مشتمل تھی لیکن شیعہ بھی وہاں آباد تھے۔ اور دونوں فرقوں میں رشتے ناطے بھی ہوتے تھے اور ایک دوسرے کی مذہبی تقریبات میں شریک بھی ہوتے تھے۔ سعید مرحوم کا یہ شعر کامٹی کی ایک روایت کا حامل ہے۔

ہے قول اپنے خامۂ مدحت نگار کا　　مدّاح ہوں میں پنج تن و چار یار کا

نعت کا یہ شعر بھی قابلِ توجہ ہے۔

ہے پھولوں سے رنگین رخِ یارِ محمدؐ　　ہے سرو سے بالا قد و زیبائے محمدؐ

سلام کے یہ دو شعر بھی لطفِ زبان کا دلکش نمونہ پیش کرتے ہیں۔

ہر غلامِ شہ والا کو سکندر دیکھا　　ہر گدائے درِ سرور کو تونگر دیکھا

آپ کے ذکر میں پایا جسے روتا پایا　　آپ کی یاد میں دیکھا جسے مضطر دیکھا

ان دونوں اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ سعید مرحوم لکھنؤی اسکول کی خارجی شاعری کے نقیب تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ مرزا داغ دہلوی مرحوم کے اثر کو قبول کر رہے تھے۔ سلام کے ان دو شعروں کی سادگی، صفائی، بے ساختگی اور برجستگی دہلی کے طرزِ شاعری کی غمازی کرتی ہے۔

اردو غزل کی ایک مستحسن روایت عشقِ حقیقی اور معرفتِ حق کا بیان بھی ہے اور اس سلسلہ میں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ خارجی شاعری کے نقیب بھی جب اس میدان میں قدم رکھتے ہیں تو ان کے رنگِ سخن اور طرزِ شعر میں ایک نکھار پیدا ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ترا پتہ کہیں ہم کو ملے نہ ملے　　تلاش سے ہمیں مطلب ہے جستجو سے غرض

بھلا کس آنکھ سے ہم مجمعِ محشر میں دیکھیں گے　　کہاں تو اے تمنائے جمالِ دل رُبا لائی

میں نے اس چشمِ تصوّر کی عنایت سے سعید　　جس طرف آنکھ اٹھی جلوۂ جاناں دیکھا

غیر ممکن ہے رسائی جلوہ گاہِ یار تک　　لاکھ چکّر صبح سے تا شام کھائے آفتاب

اللہ کی بے حساب رحمت کا بیان بھی اردو غزل کی مسلّمہ روایت ہے۔ سعید مرحوم نے اس ذیل میں بعض بڑے پُر اثر شعر کہے ہیں۔

ہو کے غفّار خدایا سرِ محشر　　پرسشِ جرم گنہگار یہ کیا

اہلِ عصیاں کے سوا شیخ بھلا کیا جانے　　ہوتی ہے خالقِ کونین کی رحمت کیسی

گنہ ہمارے اگر بے حساب ہیں تو کیا　　نہیں ہے رحمتِ حق بے حساب اے واعظ

ہر وقت زاہدوں کی غضب پر نگاہ ہے　　مشتاق ہوں میں رحمتِ پروردگار کا

اُن کے غیر مطبوعہ کلام میں دو نظمیں بھی شامل ہیں جن کا تعلق خلافت تحریک سے۔ ایک کا عنوان "قومی نظم" ہے جو ۱۰ ارجون

۱۹۲۳ء کی تصنیف ہے اس کے ذیل کے پہلے دو اشعار انتخاب کلام سعید (ص ۱۱۴) میں بھی شامل ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

کیوں دعاؤں میں کچھ نہیں ہوتا اثر — بدنصیبی کیوں نصیب دشمناں ہوتی نہیں
آنکھ پہلے سے کھلی رہتی جو اہلِ ہند کی — رائیگاں یوں دولتِ ہندوستاں ہوتی نہیں
اس قدر کھادی کا ہونے پر بھی عالم میں رواج — کم بدیشی مال سے کوئی دکاں ہوتی نہیں

دوسری نظم کا عنوان "مدح غازی کمال پاشا" ہے جو سعید مرحوم کے بیاض میں شامل ضرور ہے لیکن اسے کاٹ کر مسترد کر دیا گیا ہے اس نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

غیر اقوام ترقی کے لیے کوشاں ہوں — قومِ مسلم میں رہے ہر گھڑی تیرا ہیر

"ارمغانِ جدید" کے بعد ۱۸۹۳ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان "جلوۂ یار" میں شائع ہونے والا سعید مرحوم کا سارا کلام تو حاصل نہ ہو سکا اور اس کمی کی وجہ سے ان کے کلام میں جو پختگی اور زبان کی صفائی ان کے بعد کی شاعری میں ملتی ہے اس کا پوری طرح احاطہ اس مختصر جائزے میں ممکن نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر محمد شریف الدین ساحل نے اپنی کتاب "کامٹی کی ادبی تاریخ" (کامٹی بزمِ غالب ۱۹۸۲ء) میں "جلوۂ یار" (اکتوبر۔ نومبر ۱۹۱۰ء) میں چھپی ہوئی ایک غزل کے چند اشعار نقل کیے ہیں جن سے سعید مرحوم کے کلام میں پختگی، روانی، برجستگی، زبان و بیان کی صفائی اور سادگی کا اچھا نمونہ ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

یہ تنہائی میں اپنے جی کے بہلانے کا ساماں تھا — نظر میں دل ربا پہلو میں دل اور دل میں ارماں تھا
نہ دیتا میں جو اپنی جان گھبرا کر تو کیا کرتا — کہ ٹلنا تیرا دشوار اے بلائے شامِ ہجراں تھا
دکھائی تم نے شکل اپنی تو سب کچھ مل گیا مجھ کو — نہ کوئی اور حسرت تھی نہ کوئی اور ارماں تھا
جہاں والے ہمیشہ جستجو میں جس کی رہتے ہیں — بسا تھا وہ مرے دل میں، مری آنکھوں میں پنہاں تھا
نہ وقتِ نزع وہ آئے، نہ دل کی آرزو نکلی — سعید ان کو ذرا ہم دیکھ لیتے بس یہ ارماں تھا

یہ ایک سرسری تعارف ہے۔ نہ یہ تبصرہ ہے اور نہ ہی تنقید، جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ پڑھنے والوں کو سعید مرحوم کے رنگِ تغزل کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جائے جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ سعید مرحوم نے جس فضا اور ماحول میں اپنی شاعری شروع کی۔ وہ لکھنؤ کے مدرسۂ فکر کی شاعری کا خارجی دور تھا اور اس دور میں ہر شاعر کی۔ یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ غزل کے طے شدہ مضامین کو لفظی رعایتوں کے سانچے میں ڈھال دے۔ کبھی کبھی خارجی شاعری کے اس دور میں شاعری کی اپنی فکر اور اپنا مشاہدہ بھی شامل ہو جاتا تھا۔

سعید مرحوم اپنے دور کے ایک ممتاز اور کامیاب شاعر ہی نہ تھے بلکہ انھوں نے گونڈوانے کے ایک چھوٹے سے شہر کامٹی میں اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے اردو شعر و شاعری کی ایک ایسی شمع روشن کی، جس کی تابانی اب تک برقرار ہے اور کامٹی آج بھی اس خطہ میں اردو شعر و سخن کا گہوارہ ہے۔ سعید مرحوم کا یہ کارنامہ اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ شکر گزاری کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔

اُردو لکھیے اُردو پڑھیے

غزل نما

تعارف و انتخابِ کلام

سراج اورنگ آبادی

ادا جعفری

نام سید سراج الدین۔ تخلص سراجؔ۔ والد کا نام سید درویش تھا۔ جن کا ذریعہ معاش معلمی کا پیشہ تھا۔

پیدائش ۱۱۲۸ھ مطابق ۱۷۱۵ء۔ وفات ۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۶۳ء

سراجؔ سادات کے ایک برگزیدہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اجداد اورنگ آباد کے مشائخین میں سے تھے۔

بارہ سال کی عمر تک اپنے والد سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد طبیعت پر وحشت طاری ہوگئی۔ جنگلوں میں نکل جاتے۔ کبھی کسی مزار پر بیٹھے ہوئے نظر آتے تو اُن کے والد پکڑ کر واپس لے آتے۔ لیکن وہ پھر گھر سے بھاگ جاتے۔ سید درویش کی اکلوتی اولاد تھے۔ کچھ عرصہ پابہ زنجیر رکھا گیا۔ سات سال تک یہ کیفیت رہی۔ جب افاقہ ہوا تو شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے ہاتھ پر بیعت کی اور جب تک مرشد زندہ رہے اُن کے قدموں سے جُدا نہ ہوئے۔ اور اُن کے فیضِ صحبت سے سراجؔ ایک باکمال صوفی ہوگئے۔ ۱۱۶۱ھ میں شاہ صاحب کا انتقال ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سراجؔ ترکِ لباس کر کے فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔

سراجؔ کی شاعری ان کی صحرا نوردی اور بے خودی کے زمانے میں شروع ہوئی۔ ابتدا میں فارسی شعر موزوں کرتے تھے۔ اردو شاعری کا آغاز بیعت کے بعد ہوا۔ اور بہت جلد ان کا اُردو دیوان مرتب ہو گیا۔ جس میں تقریباً پانچ ہزار اشعار تھے۔ اُن کے اشعار اُن کے برادر طریقت عبدالرسول خاں جمع کر لیا کرتے تھے۔

سراجؔ کا ضخیم کلیات جس میں غزلیں، مثنویاں، قصیدے، رباعیات وغیرہ شامل ہیں صرف پانچ چھ سال کے عرصے میں لکھا گیا۔ سراجؔ کی ایک مثنوی "بوستانِ خیال" ہے جس کو اُن کی آپ بیتی کہا جاتا ہے۔ یہ طویل مثنوی صرف دو دن میں مکمل ہوئی۔ اس کے بعد مُرشد کے حکم پر غزل گوئی ترک کر دی۔ شعر گوئی ترک کرنا ایک شاعر کے لیے ممکن نہ تھا اس لیے خیال ہے کہ مثنویاں اس کے بعد بھی لکھتے رہے۔ ساتھ ہی مطالعہ جاری رہا۔ اور فارسی اساتذہ کے کلام کا ایک انتخاب "منتخب دیوانہا" کے نام سے تیار کیا۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ سراجؔ نے شادی نہیں کی تھی۔

سراجؔ قدیم اور جدید اردو شاعری کے درمیان ایک بہت اہم رابطے کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ دکن کی ریاستوں کے زوال کے بعد جہاں قدیم اردو شاعری کی نشو و نما ہوئی تھی۔ اورنگ آباد کی سرزمین کو علمی اور ادبی مرکز کی حیثیت

ہوگئی تھی۔ سراج کی شاعری کا وہی زمانہ تھا جب اُن کے پیش رو اور ہم وطن ولی کی شاعری کی گونج دکن سے دہلی تک پہنچ چکی تھی۔ اور اردو شاعری میں ایک نئے رنگ کا آغاز ہو رہا تھا۔ سراج اُس زمانے کے اہم ترین شاعر ہیں۔ ولی کے انتقال کے بعد شاعری میں سراج اُن کے جانشین سمجھے جاتے تھے۔

سراج کے کلام میں سوز و گداز بھی ہے اور سادگی اور بے ساختگی بھی۔ اُن کی شاعری میں مقامی رنگ کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کا اثر بھی بڑے دل پذیر انداز میں نظر آتا ہے۔ سراج کی شاعری میں عشق مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کی زندگی عشق و محبت اور شعر و سخن کی زندگی تھی۔ سراج نے اپنی ساری عمر عشقِ الٰہی اور کیف و سرخوشی کے عالم میں گزاری۔ وہ ایک صاحبِ کمال صوفی تھے۔ اُن کے مُرید اور شاگرد بہ کثرت تھے۔ جن میں صاحبِ حیثیت لوگ بھی تھے جو اُن کی خدمت کو عین سعادت سمجھتے تھے۔ حصولِ معاش کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں تھا۔ نہ کسی امیر کے دامانِ فیض سے وابستہ ہوئے نہ اراکینِ سلطنت سے انھوں نے کوئی تعلق پیدا کیا۔ انھوں نے بغیر خواہش بہت کچھ حاصل کیا اور جو کچھ ملا وہ راہِ الٰہی میں صرف کر دیا۔

سراج کے ہم عصر اُن کے ذاتی اوصاف اور شعری کمالات دونوں کا اعتراف اور احترام کرتے تھے۔

سراج نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل اور مثنوی میں انھیں لازوال شہرت نصیب ہوئی۔

یہ انتخاب "سراجِ سخن"، مرتبہ عبدالقادر سروری (مطبوعہ ۱۹۳۶ء، حیدر آباد، دکن) سے کیا گیا ہے۔

حالاتِ زندگی "سراج اورنگ آبادی۔ شخصیت و فن"، (مرتبہ پروفیسر سید شفقت رضوی) سے حاصل کیے گئے۔

انتخابِ کلام

میرے جگر کے درد کا چارا کب آئے گا — اک بار ہو گیا ہے، دو بارا کب آئے گا
پتلی ہمارے نین جھروکے میں بیٹھ کر — بیکل ہو جھانکتی ہے پیارا کب آئے گا

آیا پیا، شراب کا پیالا پیا ہوا — دل کے دیے کی جوت سے کاجل دیا ہوا

میں نہ جانا تھا کہ تو یوں بے وفا ہو جائے گا — آشنا ہو اس قدر نا آشنا ہو جائے گا

آبِ رواں ہے حاصل عمرِ شتابِ رَو — لوحِ فنا میں نقش نہیں ہے ثبات کا
رخسارِ یار حلقۂ کاکل میں ہے عیاں — یہ چاند ہے سراج اماوس کی رات کا

نہیں رہا سخنِ آب دار کا موتی — سراج طبع کے سب جوہروں کو رول چکا

بے فکر میں نہیں کہ صنم مست خواب ہے — کیا کیا بلا کرے گا جو بیدار ہوئے گا
پنہاں رکھا ہوں درد کو مالوہو کے گھونٹ پی — کہتا نہیں کسی سے کہ اظہار ہوئے گا

دورنگی خوب نئیں یک رنگ ہو جا
سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا
کہا کس تیرہ دل نے تجھ کو اے غم
کہ دل کی آرسی پر زنگ ہو جا

مت کر و شمع کو بدنام جلاتی وہ نہیں
آپ سے شوق پتنگوں کو ہے جل جانے کا

ٹک ماہِ نو کی جانب اے ماہ رو نظر کر
خم ہو ترے بھنوؤں کو کرتا سلام گویا
شعرِ سراج از بس عالم میں ہے زباں زد
دیوان کی زمیں ہے دیوانِ عام گویا

دھوپ میں غم کی عبث دل کو جلایا افسوس
اس کے سائے میں اماں تھا مجھے معلوم نہ تھا
شبِ ہجراں کی نہ تھی تاب مجھے مثلِ سراج
رُخ ترا نور فشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

جس کا دل شوق میں جیوں آئینہ حیراں نہ ہوا
سب ہوا لائق ہم چشمیٔ جاناں نہ ہوا

جل گیا شوق کے شعلوں میں سراجؔ
اپنی دانست میں بے جا نہ کیا

لیا کاسۂ سر کو وہ ہاتھ میں
ترے وصل کا جو سوالی ہوا
لباسِ بسنتی ترا دیکھ کر
مجھ آنکھوں کا آنسو گلابی ہوا

مذہبِ زاہداں سے برتر ہے
عاشقِ پاکباز کا مشرب

وصل کے دن شبِ ہجراں کی حقیقت مت پوچھ
بھول جاتی ہے مجھے صبح کو پھر شام کی بات

لذتِ شبِ وصال کی مت پوچھ صبح کوں
رہتا نہیں فجر کو مجھے شب کا خواب یاد

آشنا بی کہ آج بیکل ہوں
طاقتِ انتظار نئیں ہرگز
مے کشانِ شرابِ وحدت کوں
روزِ محشر خمار نئیں ہرگز

اے باغِ حیا دل کی گرہ کھول، سخن بول — تنگی ہے مرے حال پہ اے غنچہ دہن بول
آتی ہے تجھے دیکھ کے گل رو کی گلی یاد — اے بلبلِ بیتاب مجھے اپنا وطن بول
خاموش نہ ہو سوزِ سرآج آج کی شب پوچھ — بھڑکی ہے مرے دل میں ترے غم کی اگن بول

کون کہتا ہے جفا کرتے ہو تم — شرطِ معشوقی وفا کرتے ہو تم
ہم شہیدوں پر ستم! جیتے رہو — خوب کرتے ہو، بجا کرتے ہو تم

سرآج آتشِ عشق میں جل گیا ہے — پتنگوں کی آخر یہی ہیں سزائیں

خوبوں کو روا ہے قتلِ عاشق — اس شہر میں رسمِ خوں بہائیں

اگن میں ہجر کی جلتا ہوں میں سدا جاناں — زلالِ وصل سے یہ آگ آبجھا جاناں
چھپا نہیں ہے کہیں آفتاب پردے میں — عبث نقاب میں چہرے کو مت چھپا جاناں

نہ پوچھو، خود بہ خود کرتا ہوں تعریف اس کے قامت کی۔ کہ یہ مضمون مجھ کو عالمِ بالا سے آتے ہیں

یار کوں بے حجاب دیکھا ہوں — میں سمجھتا ہوں خواب دیکھا ہوں
یہ عجب ہے کہ دن کو تاریکی — رات کو آفتاب دیکھا ہوں

جس کوں راہِ چشم سے خونِ جگر جاری نہیں — یوں ہوا معلوم اُس کوں زخمِ دل کاری نہیں
طبع نازک سے تری ڈرتا ہوں، ورنہ اے صنم — جاں نثاری تجھ قدم پر مجھ کوں دشواری نہیں

ڈوب جاتا ہے مرا جی جو کہوں قصۂ درد — نیند آتی ہے مجھی کو مرے افسانہ میں
اس ادب گاہ کو تو مسجدِ جامع مت بوجھ — شیخ بے باک نہ جا گوشۂ میخانہ میں

گردشِ مے سوں آج فارغ ہے — جس نے دیکھا ہے خوش نین کے نین

کیا ہوئے گا سنو گے اگر سان دھر کے تم
گزریں برہ کی رات جو مجھ پر کہانیاں
دامن تلک بھی ہائے مجھے دسترس نہیں
کیا خاک میں ملی ہیں مری جاں فشانیاں
کب تک روا رکھو گے تغافل سراج پر
اب اس قدر بھی خوب نہیں سرگرانیاں

مری آنکھوں کے دونوں پٹ کھلے ہیں انتظاری میں
بہانہ مت کرو گر تم کو آنا ہے تو آجاؤ

زہر شیریں نگہِ لطف کا کافی ہے مجھے
جان لینا ہے تو مت تیغ تغافل کھینچو

محراب بیچ سجدہ ریائی ہے زاہدو!
ان ابروؤں کو دیکھ کے قامت کو خم کرو

کبھی تم مول لینے ہم کو ہنس ہنس بھاؤ کرتے ہو
کبھی تیرِ نگاہِ تند کا برساؤ کرتے ہو

دلِ آشفتہ کا مرے احوال
اس کی زلفِ سیاہ سے پوچھو
بے گناہوں کو کیوں کرے ہے شہید
اپنی تیغِ نگاہ سے پوچھو

اے دوست تلطّف سے مرے حال کو آ دیکھ
سینہ کی اگن مہر کے پانی سے بجھا دیکھ

پلا کر جام اپنی چشم کی گردش سے پے در پے
کیا ساقی نے مجھ کو بے خبر آہستہ آہستہ

ہے ترے قد پہ زلف خم در خم
نخل صندل پہ ناگ جیوں لٹکے

زاہدِ خشک کوں شراب نہ دے
آگ دے خار و خس کو آب نہ دے

جہاں مجھ غم کی آتش جلوہ گر ہے
وہاں دوزخ کا قصّہ مختصر ہے

جس کی طرف ادا سے وہ ساقی نظر کرے
کونین کے خیال ستی بے خبر کرے
بیں وقت پا کے اس کو سناؤں گا یہ غزل
دردِ دلِ سراج مگر کچھ اثر کرے

ہوش کھونے کو مے نہیں درکار　　گردشِ چشمِ مست کافی ہے

پوچھتا ہے وہ قدرِ شعرِ سراجؔ　　جو ادا فہم اور سخن داں ہے

بھڑکے ہیں مرے دل میں برہ آگ کے شعلے　　وہ جان سراجؔ آکے بجھا دے تو بجا ہے

تجھ جدائی میں مرے سر پہ غضب کیسا ہے　　رات آئی ہے مری جان کو دن بیتا ہے

مری آنکھوں کے دونوں پٹ کھلے تھے انتظاری میں　　سو ویسے میں یکایک دیکھتا کیا ہوں، کہ آتا ہے

خبرِ تحیرِ عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی　　نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی
شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی　　نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی
ابھی سمت غیب میں کیا ہوا، کہ چمن ظہور کا جل گیا　　مگر ایک شاخِ نہالِ غم، جسے دل کہو سو ہری رہی
نظرِ تغافلِ یار کا، گلہ کس زباں میں کروں بیاں　　کہ شرابِ صد قدح آرزو خمِ دل میں ہے سو بھری رہی
وہ عجب گھڑی تھی میں جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا　　کہ کتابِ عقل کی طاق میں جو دھری تھی یوں ہی دھری رہی
ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سے یہاں ہوا　　کہ نہ آئینہ میں جِلا رہی، نہ پری کو جلوہ گری رہی
کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراجؔ کو　　نہ خطر رہا، نہ حذر رہا، مگر ایک بے خطری رہی

چینی کہانیاں

تہذیب و ترجمہ ——— شفیع عقیل

صفحات: ۲۴۰ ——— قیمت: ۱۲ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ ــــ کراچی ۱

غیر افسانوی طرزِ تحریر

اور مطالعہ و تحقیق

پروفیسر یونس شرر

موجودہ عہد میں ہم انسانی کرشمہ سازیوں کی جس بے پناہ عملی قوت کے مظاہروں سے دوچار ہوئے ہیں، اس کا ادراک بھی انسان کو نہ تھا۔ ابھی چند برسوں پہلے تک وہ شعور اور اپنی ذات و صفات کی نفسیاتی الجھنوں سے نجات حاصل نہ کر پایا تھا اور نہ اسے مسافرت کے عالم کا اندازہ تھا۔ اپنے آپ سے اس کرۂ ارض کے مختلف خطوں پر نبرد آزما تھا اور یقین اور بے یقینی کی راہ پر گامزن قربت و دوری کے شدید احساس سے دوچار تھا۔ اقوامِ عالم پر یہ ایک ایسی کیفیت تھی جس میں تھکن اور تنہائی کے ساتھ زندگی کے بے سود ہونے کا احساس بھی جگہ پا گیا تھا۔ ہم انسانی تاریخ کے بڑے بڑے اَلمناک واقعات سے گزر کر آئے ہیں، انسانی تاریخ کے بڑے ہولناک تغیّرات دیکھے ہیں اور نہ جانے کتنے بڑے تغیّرات سے ہم گزرنے والے ہیں۔ جوہری توانائی کے دَور میں ارتقائے انسانی کے باوصف کچھ قرائن و قیاس ایسے بھی ہیں کہ ہم سب کچھ بھول کر اچانک پلٹ کر کسی بڑے حادثے سے دوچار نہ ہو جائیں۔ اور زمین کی سطح سے خلا تک دھوئیں اور گیس کے بادلوں میں نہ تحلیل ہو جائیں۔ اس اندیشے کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ فطرتِ انسانی اس امر کی غمّاز ہے کہ وہ تغیّر پذیری کے عمل میں توازنِ طاقت کو کسی وقت بھی کھو بیٹھتی ہے۔

آج کائنات کے نئے شعور اور ادراک کے طفیل انسان زندگی کی نئی سمت اور نئی جہت سے ہمکنار ہوا ہے، محسوسات کو نئی قوت ملی ہے، کائنات کی گرہ کشائی جس تیزی سے اس دور میں ہوئی ہے وہ انسانی سفر کی تاریخ میں بے مثال ہے۔ نئے نئے انکشافات و ایجادات نے جہانِ معنی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ آج زمین، خلا اور چاند کی سرزمین تک کی مہم نے حیرتوں کے سلسلے پھیلا دئے ہیں۔ تجسّسِ انسانی کی کارفرمائیاں اُس کی قوت اور کائنات پر دسترس کی گواہی دے رہی ہیں۔ اس بدلتے ہوئے کرۂ ارض سے باخبر رہنے کی خواہش نے غیر افسانوی تحریروں کو مقبولیت بخشی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی کے سبب پڑھنے والے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر کے باخبر رہنا چاہتے ہیں۔ آج وہی تحریریں زیادہ پڑھی اور پسند کی جاتی ہیں جو وقت اور ضرورت کے اعتبار سے زیادہ معلوماتی ہوں اور زمانے کے تغیّرات، امکانی پہلوؤں اور انقلابی تبدیلیوں کو پیش کرتی ہوں۔ مُراد یہ ہے کہ جو زمانے کے ساتھ معرضِ وجود میں آتی ہوں۔

موجودہ عہد میں مطالعہ اور تحقیق کے نئے انداز نے اسباب و عناصر کی اساس کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ حیرت افزا اور حیران کن

ماحول سے ہم اس طرح گزر رہے ہیں کہ چیزوں کی اصل حقیقت کے مفروضے لمحوں میں ایک نئے مفروضے اور نئی حقیقت کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ خلا اور آسمان کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے اسرار کی پردہ کشائی کائنات اور اشیاء کے علم سے انسان کی ذہنی وابستگی اس کے مطالعہ اور تحقیق کا مرکز بنی ہوئی ہے، علم و آگہی کے سوتے پھوٹ رہے ہیں، ادراک کی روشنی نظر کو خیرہ کر رہی ہے اور مطالعہ و تحقیق کے عمل کے لیے ایک نئے مزاج کی تعمیر میں مدد دے رہی ہے۔ انسان سچائی اور حقائق سے آگاہی کے ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے جو ہمارے لیے آج سے پہلے فرضی، تصوراتی، طلسماتی اور دیومالائی خواب گاہوں کے جھروکوں کی بنیاد بنے ہوئے تھے۔ عقل و دانش کی کارفرمائی چاند پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ آئی ہے۔

ایک ایسے ماحول میں قارئین کا ممکنہ اعتماد حاصل کرنے کے لیے مصنّف پر یہ فرض ہوگیا ہے کہ وہ اپنی تحریروں کے پھیلاؤ، معلومات کے دائرہ کار کا تعیّن کرے اور حقائق کی تہہ تک پہنچنے میں اپنے علم کا اندازہ کرے۔ اس عمل سے مصنّف کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، اس کے جذبات کو بھی تقویت ملتی ہے۔ یہ عمل ایک ایسی سیڑھی ہے جو مصنّف کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔

ایک اچھے لکھنے والے کی شناخت اور پہچان اس کی اپنی تحریر ہے، موضوع پر گرفت اور قدرتِ بیان کے ساتھ پیش کردہ مواد اگر پڑھنے والوں کا اعتماد حاصل کر جائے تو ایسے مصنّف عام طور پر جلد ہی قدآور شخصیت کے مالک بن جاتے ہیں۔ یوں تو بے شمار مصنّفین کی تحریریں آئے دن چھپتی رہتی ہیں نئے موضوعات اور نئے زاویۂ فکر و نظر کو پیش کیا جارہا ہے، مگر ان تحریروں میں کتنی ایسی تحریریں ہیں جو اپنے جوہر سے پہچان لی جائیں۔ اور ان کو باوزن، معیاری اور قابلِ قدر گردانا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہزاروں لکھنے والوں میں چند مصنّفین ایسے نکلیں گے جو اپنی تحریروں کے سبب پہچانے گئے ہیں۔ ان مصنّفین کا اگر بہ غور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے پیچھے ان کا مطالعہ، تحقیق اور علم تھا جس نے انھیں قدآور بنایا۔ اور جس کے سبب وہ قبولیت عام کے درجے پر پہنچے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنف کو قاری کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے وسیع مطالعے اور تحقیق سے گزرنا پڑتا ہے۔

آج کا ذہن مطالعے کی نئی جہت کا متقاضی اور تحقیق کی نئی سمت کا متلاشی ہے۔ علم کی بے پناہ وسعت نے اسے اس قدر کشادہ کر دیا ہے کہ تحریر کا اُتھلا پن قاری کو متوجہ نہیں کر پاتا، اعتماد تو بہت دور کی بات ہے۔ یہ صرف لفظی بازی گری سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کو حاصل کرنے کے لیئے دل لہو کرنا پڑتا ہے، پہلے اپنی ذات کو معتبر بنانا پڑتا ہے۔ جب مصنّف کو خود پر اعتماد آجائے تب قاری اور مصنّف کے درمیان اعتماد کی فضا قائم ہوتی ہے۔ مصنّف کی تحریر میں گہرائی، سچائی اور ٹھوس حقیقت کا ہونا ضروری ہے تاکہ ذہن قبول کرلے اور دل اس کا اثر محسوس کرے۔

اچھا مصنف نہایت اعتماد اور یقین کے ساتھ یہ سوچ کر قلم اٹھاتا ہے کہ اس نے موضوع سے متعلق کافی مطالعہ کیا ہے۔ اس کے پاس معلومات کا سرمایہ بھی اطمینان بخش ہے۔ ایک ایسے مقام پر پہنچ کر مصنّف کو کھل کر اپنی رائے اور قائم کردہ نقطۂ نظر کا اظہار کرنا چاہیے۔ اسے کسی بیساکھی یا سہارے کو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ موضوع پر دوسروں کی رائے کے حوالے دے کر اپنی رائے کا تعیّن کرنا مناسب طریقہ نہیں ہے، یہ انداز عام طور پر علم کی کمی کو ظاہر کرتا ہے یا موضوع پر کمزور گرفت کی چغلی کھاتا ہے۔ میری مُراد یہاں صرف یہ ہے کہ لکھنے سے پہلے مصنّف کو موضوع سے متعلق جتنا زیادہ سے زیادہ علم حاصل ہوسکے اس کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ یہ دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ اُسے ہر چیز کا مکمل علم حاصل ہے مگر اس بات کا اندازہ ضرور لگانا چاہیے کہ اس کا علم کس حد تک موضوع سے متعلق ہے اور کس حد تک وہ اس کے بارے میں جانتا ہے۔ اسے یہ علم ہو کہ موضوع کے وہ کون سے گوشے ہیں جو اس کی نظر سے پوشیدہ ہیں۔

ان گوشوں تک پہنچنے کے لیے آیا اسے دوسروں کے فراہم کردہ معلومات پر انحصار کرنا چاہیے یا اُن تک خود پہنچنا چاہیے۔

ایک ایسے دور میں جہاں مطالعہ و تحقیق کی نوعیت کا مقصود اصل حقائق سے آگاہی حاصل کرنا ہوتا کہ انسان اپنے کسی جذباتی بہاؤ میں ضبط و وقار نہ کھو بیٹھے۔ وہ اپنی کسی نئی مہم پر کامرانی کے شوق میں عجلت پسندی اور متلون مزاجی کا شکار نہ ہو جائے۔

ویسے بھی مطالعہ و تحقیق کی اہمیت اپنی جگہ مُسلّم ہے۔ تحقیقی نتائج علم میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ جدید دور میں سائنس نے جو ترقی کی ہے وہ تحقیق کے باعث ہوئی ہے۔ تحقیق بند دریچوں پر دستک دینے کے عمل کا نام نہیں ہے بلکہ ان دریچوں کو وا کرنے کا عمل ہے جو ہمارے لیے تازہ ہوا اور نئی روشنی کا پیغام لاتا ہے۔ تحقیق سے نئی نئی راہیں کھلتی ہیں، دعوتِ فکر ملتی ہے اور انسان میں آگے بڑھنے کی کوشش اور خواہش پیدا ہوتی ہے۔ سیاروں کی گزرگاہوں کا علم تحقیق کے ٹھوس نتائج ہیں۔ جس طرح مطالعہ رفعتِ فکر، وسعتِ نظر اور علم میں اضافہ کرتا ہے۔ اسی تحقیق سے علم میں پختگی اور غور و فکر کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ یہی قوت ترقی کی بنیاد بنتی ہے اور انسانی شعور کی عملی کارفرمائیاں اسے نوازتی ہیں۔

مطالعہ کا عمل میرے نزدیک اسرارِ حقائق سے آگاہی اور تحقیق اسرار و رموز کی گرہ کشائی سے حقائق تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔

کسی بھی علم کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس علم کے تحقیقی پہلوؤں پر نظر رکھیں، اور ترقی کے امکانات کا اندازہ لگاتے ہوئے صحیح منصوبہ بنائیں اور علمی کاوشوں کے ساتھ آگے بڑھیں۔ غیر افسانوی ادیب کے لیے اس کلیہ پر عمل کرنا لازمی امر ہے۔ اگر ہم شاہکار اور شہرت یافتہ تحریروں کا جائزہ لیں تو محسوس ہوگا کہ جو قوت ان تحریروں کا سرچشمہ ہے ان کی بنیاد تحقیق ہے۔ ان میں معلومات کے دفتر کھلے ہوئے ہیں، حقائق کے پردے اٹھے ہوئے ہیں۔

تحقیق، معلومات حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ غیر افسانوی ادیب تحقیقی مواد اور تحقیقی ذرائع کو اہمیت دے کر ٹھوس نتائج حاصل کرتا ہے۔ کیوں کہ انھیں حقیقت کی سطح پر عقلی دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مصنّف جو پڑھنے والوں کا اعتماد حاصل کرتے ہیں اور قاری کے بہت زیادہ قریب پہنچ جاتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انھیں اپنے علم اور اُس کے مختلف پہلوؤں کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ تحریر میں کسی ابہام اور جھول کو پیدا نہیں ہونے دیتے۔ وہ زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ اور ان کی تحریریں مقبولیت کے ساتھ زیادہ کامیابی سے ہمکنار بھی ہوتی ہیں۔ ایسے ادیب اپنے پڑھنے والوں پر اَن مٹ اور گہرے اثرات مرتّب کرتے ہیں۔

مصنّف کے لیے ضروری ہے کہ وہ جتنا جلد ممکن ہو سکے اپنے پڑھنے والوں کا اعتماد حاصل کر لے۔ اور اعتماد وہی مصنّف حاصل کر سکتا ہے جسے اپنے علم اور اپنی ذات پر مکمل بھروسہ ہوگا۔ اس لیے کہ پڑھنے والا مصنّف کا صحیح ناقد ہوتا ہے۔ وہ تحریر سے بخوبی اندازہ لگا لیتا ہے کہ مصنّف کہاں اپنی کم علمی کے باعث فریب دے رہا ہے، کہاں وہ اپنے علمی رعب جھاڑ رہا ہے اور کہاں وہ ناواقفیت کے باعث ابہام اور الجھن کا شکار ہو گیا ہے۔ تحریر میں مصنّف کھل کر سامنے آتا ہے اور تحریر تو بڑے بڑے مصنّفوں کے بھرم کھول دیتی ہے۔ اس لیے کسی رائے اور نتائج کو اخذ کرتے ہوئے مصنّف کو پورے حق و اختیارات کے ساتھ لکھنا چاہیے۔ جلدی اور لاپروائی سے لکھی جانے والی تحریروں سے گریز کرنا چاہیے۔ بے وزن تحریریں مصنّف کو ہمیشہ کے لیے پڑھنے والوں کی نظر میں گرا دیتی ہیں۔

مصنّف کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے جو اس کی قدرت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ قدرت و مہارت وہاں خام نظر آنے لگتی ہے جہاں مطالعہ کی کمی ہو۔ مطالعہ کی کمی بہت سی اہم معلومات سے محروم کر دیتی ہے۔ اور نفسِ مضمون پر مصنّف کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے معلومات

کی فراہمی نہ ہونے کے سبب تحریر میں جگہ جگہ خلا پیدا ہو جاتا ہے اور صحیح اظہار اور ابلاغ سے تحریر محروم ہو جاتی ہے۔

میں ایک بار پھر اُن امور کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو مصنف کی کامیابی کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

(۱) ضروری علم کے حصول کے لیے مطالعہ کرنا۔ (۲) صحیح علم سے آگاہی کے لیے حقیقی ذرائع اختیار کرنا۔ مصنّف کی غفلت، سہل پسندی اور ثانوی ذرائع پر اکتفا درج ذیل نتائج کا باعث بنتا ہے۔

(۱) ثانوی ذرائع سے اصل کا ادراک نہیں ہو پاتا (۲) واسطے اور وسیلے اصل حقائق تک مکمل رہنمائی کا ذریعہ نہیں بن سکتے (۳) ثانوی ذرائع خیال و نظر کو نتائج حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہونے کے بجائے تشکیک اور رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ (۴) اصل سے ناواقفیت اعتماد میں کمی پیدا کرتی ہے (۵) مصنّف تحریر میں اپنا استحقاق کھو بیٹھتا ہے (۶) مصنّف ایک بااختیار صاحبِ علم کی حیثیت سے خود کو پیش نہیں کر پاتا۔ اس امر کا اندازہ اس کے پڑھنے والے بخوبی لگا لیتے ہیں۔ قارئین پر مصنّف کو اپنا اعتبار قائم کرنے اور اپنے علم پر اعتماد بحال کرنے کے لیے اپنے علم کا جائزہ لینا چاہیے اور اپنی تحریروں کی صحیح طور پر جانچنے کی کوشش کرنی چاہئے اور پھر اپنی رہنمائی کے لیے مندرجہ ذیل اصولوں کو اپنی تحقیق کا ذریعہ بنانا چاہیے۔

اصل اور حقیقی ذرائع

ہمیشہ اصل کا مطالعہ و مشاہدہ ہی اصل حقائق تک پہنچنے میں صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ کسی شے کی کمیت یا ماہئیت یا کسی فلسفے یا نظریے کی اصل تک پہنچنے کے لیے حقیقی ذرائع سے حاصل کیا ہوا علم ہی قابلِ اعتماد بنیاد ہے۔ ہر شخص اپنے مخصوص علم کے باعث ایک خاص نظریے اور نقطۂ نظر کا حامل ہوتا ہے اور وہ اس کائنات کی ہر شے کو اپنے نظریے کی عینک سے دیکھتا ہے۔ مطالعہ اور تحقیق سے اکتساب کی صورت میں بھی اس کا یہ رویّہ برقرار رہتا ہے۔ انسان ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ رویّوں میں، اثرات کو قبول اور رد کرنے میں، اس کے عناصر ترکیبی کی تشکیل، ہر لحاظ سے ایک فرد دوسرے سے الگ ہے۔ اس لیے کسی دوسرے شخص کا پیش کردہ حاصل مطالعہ قابلِ اعتبار بنیاد نہیں۔ یہ اسی وقت مفید اور استفادہ کے لائق ہے جب مصنّف نے خود بھی اصل کا مطالعہ کیا ہو۔

مختلف خطوں اور علاقوں میں بسنے والے افراد جس یقین کے ساتھ اپنی زندگی کی ضروریات، رسوم و رواج اور اپنی سرزمین کے موسمی تغیّرات سے واقف ہیں ہم کسی ذریعے سے اگر آگاہ بھی ہو جائیں تو اس کی اصلیت کا اس لیے اندازہ نہیں کر سکتے کہ خود پر گزری ہوئی حقیقت کا رمز کچھ اور ہوتا ہے اور دوسرے کے قبول کردہ تاثرات میں اس کی شخصیت کا پرتو بھی شامل ہوتا ہے۔ اسی طرح بڑی بڑی ایجادات کے علم کا مسئلہ ہو۔ یا نئی اور سنسنی خیز دریافت کا معاملہ ہو یا دنیا کے ممتاز مفکرین کی فکر تک رسائی کا سوال۔ اس اصول کا اطلاق ہر قسم کے علم کے حصول پر کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم برا آؤن، رومی اور اقبالؔ کی تعمیر خودی کے فلسفے کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ثانوی ذرائع معلومات پر انحصار نہیں کر سکتے۔ نطشے، ہائیڈیگر، کازوال اور کیئر کے گارڈ نے اجتماعیت سے فرد کی طرف جس انداز میں فلسفیانہ فکر کے سفر کا رُخ موڑا ہے اس میں کسی ایسے فرد کی رائے اعتماد کی بنیاد نہیں بن سکتی جو افلاطون کا بھی پرستار ہو۔ ایسے شخص کا تجزیہ اصل تہہ تک پہنچنے میں مانع ہو گا۔ اس لیے بہتر صورت اصل کا مطالعہ اور تحقیق ہے۔ غیر افسانوی ادیب کے لیے یوں بھی ضروری ہے کہ اس کی تحریر حقائق کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

مکمل مطالعہ:- آج مطالعہ اور تحقیق دونوں سائنٹفک عمل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ جب بھی کسی چیز یا کتاب کا مطالعہ یا

مشاہدہ کریں تو اس کی تمام جزئیات کے ساتھ مطالعہ یا مشاہدہ کرنا چاہیے۔ خاص طور پر مطالعہ کرتے وقت پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ جستہ جستہ یا منتخب حصوں کے مطالعے سے مطالعے کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کا مطالعہ لغزشِ نظر پیدا کر سکتا ہے اور کتاب میں پیش کردہ فلسفے کی صحیح تفہیم میں ہماری رہنمائی نہیں ہوتی۔ اگر آپ نے ابتدا سے آخر تک کتاب کا مطالعہ کیا ہے تو آپ اس کے ہر پہلو سے باخبر ہیں۔ آپ کو معلومات بھی پوری طرح حاصل ہو گی اور نظریے کی اساس کا بھی اندازہ ہو گا۔ مطالعہ کی یہی صورت قابلِ بھروسہ اور قابلِ یقین ہے۔ اس صورت میں معلومات پر اعتماد قائم ہو سکتا ہے۔

پوری کتاب کے مطالعے سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اظہار و ابلاغ کے لیے مصنّف نے کس سطح اور نہج کو اختیار کیا ہے۔ موضوع سے مواد کو ہم آہنگ رکھنے کے لیے زبان و بیان کے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے۔ اچھے مصنّفوں کے موضوع اور مواد کی پیش کش ہمیشہ رہنمائی کرتی ہے۔ اس لحاظ سے کسی مصنّف کا مطالعہ کرنے کے لیے کتابوں کا انتخاب خود کرنا چاہیے۔ مطالعہ کے لیے دوسرے کی انتخاب کردہ کتب زیادہ مفید نہیں ہوتیں۔ مطالعے کے لیے ایسی کتابوں کا انتخاب کرنا چاہیے جو مضمون اور اسلوب دونوں اعتبار سے صحتِ نظر بخشیں۔ مطالعہ کا یہ عمل مصنّف میں بھی خود اعتمادی پیدا کرتا ہے۔ اور اس کی تخلیقات کو پڑھ کر قارئین میں بھی اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ عام طور پر ایسی تحریریں اور کتابیں جو ابہام، الجھن، پیچیدگیوں اور علامتوں سے عبارت ہیں، وہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتیں۔ ان کی تفہیم انسانی ذہن کو کوئی واضح اور مستقل نظر نہیں بخشتی۔ پڑھنے والا کچھ سوچتا ہے، لکھنے والے کی نظر کچھ اور ہے اور بیان کرنے والے نے اسے کچھ اور معنی پہنا دیے ہیں۔ یہ تحریریں مصنّف کے ذہن پر خوش گوار اثرات نہیں چھوڑتیں۔ مصنّف مطالعہ کے دوران اعتبار نہیں کر پاتا۔ یہ بے اعتباری حاصلِ مطالعہ کے طور پر بے اعتمادی کی فضا میں لے جاتی ہے۔ مصنّف کو اپنا اعتماد بحال رکھنے کے لیے اپنے مواد کا خود انتخاب کرنا چاہیے۔ کسی دوسرے پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔

مواد، مختلف ذرائع اور استفادہ:-

مصنّف کو مواد کے حصول میں کسی ایک ذریعے پر انحصار کرنے کے بجائے مختلف ذرائع سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں اپنی استطاعت کے مطابق جس قدر زیادہ کوشش کر سکتا ہے کرنی چاہیے۔ جتنے زیادہ ذرائع میسّر ہوں گے اس کے مواد کو تقویت ملے گی اور اس کو بیان کرتے ہوئے وہ زیادہ اعتماد سے بات کرنے کا اہل ہو گا۔ مواد کو اکٹھا کرتے وقت پوری چھان پھٹک کر لینی چاہیے تاکہ حقیقت واصلیت بھی کھل جائے اور تقابلی جائزے کا بھی موقع مل سکے۔ اس عمل سے مصنّف کو حاصل کردہ معلومات کی صحت کا علم بھی ہو جائے گا جو اس کے حق میں بھی مفید ہو گا اور قاری اس کے با اختیار انداز سے پورا فائدہ اٹھائے گا۔

مواد کے حصول میں مختلف مصنّفین کی آرا بھی بڑی مدد دیتی ہیں۔ اس طرح مصنّف کے سامنے ایک ماہرانہ رائے آ سکتی ہے اور اس ماہرانہ رائے کی اہمیت کو علمی سطح پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیق کے لیے یہ کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ مختلف ذرائع کے بجائے مصنّف کا ایک ذریعہ پر انحصار اس کے مواد کو محدود بھی کر سکتا ہے۔ اس کے پھیلاؤ میں مدد نہیں مل سکتی اور دوسرے مصنّف کا کسی ایک کے منہ کا لقمہ بن کر رہ جانے کا بھی خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں مصنّف کی اپنی سوچ مفقود ہو جائے گی، اس کی اپنی رائے اس کی اپنی آواز نہیں ہو گی بلکہ یہ دوسرے کی نمائندگی کرے گی۔

بہ غور مطالعہ:۔ مصنّف کے لیے ضروری ہے کہ وہ مواد کا مطالعہ کرتے وقت اپنی پوری توجہ صرف کرے۔ اس توجہ سے وہ مواد کے مختلف پہلوؤں کا بھی بہ خوبی اندازہ لگا سکے گا اور اس کی کمی بیشی سے بھی آگاہ رہے گا۔ بہ غور مطالعہ اس کی ضرورت کا بھی احساس دلاتا رہے گا۔ اور وہ نکات جو اس کی توجہ کے طالب ہیں انھیں وہ آسانی سے اپنی گرفت میں لا سکے گا۔ یکسوئی اور توجہ اس پر امکانات کے دروازے کھول دے گی۔ زیرِ مطالعہ کتاب یا تحریر پر وہ اپنی رائے کا اظہار بلا جھجک کر سکے گا۔ اس اظہار میں اس کا اعتماد بھی ساتھ دے گا۔ اور اس کا علم بھی معاون رہے گا۔ اس لیے کسی ایسی کتاب یا تحریر پر اپنی رائے دینے سے گریز کرنا چاہیے جس کا مطالعہ بہ غور نہ کیا ہو۔ مصنّف کو سچّائی سے کام لینا چاہیے۔

سچّائی کا مطالبہ اور مصنّف:۔ نہایت دیانت دار شخص شاذ و نادر ہی سچ بولتا ہے، تاریخِ انسانی اس کی شاہد و گواہ ہے۔ سچ خود ایک زہر ہے اور یہ زہر بہت مشکل سے پیا جاتا ہے۔ سوائے پیغمبروں اور ربّانی کتابوں کے سچ کا مطالبہ ــــ ایک مبالغہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن سچ پر ایمان لے آنا بھی جگر کاوی ہے۔ ادب کی تخلیق سچّائی کا عمل ہے۔ خونِ جگر سے اس کو شاداب رکھا جاتا ہے۔ ریاکاری کی سیج پر آرزومندی کا عجز کارگر نہیں ہوتا اس لیے ہم مصنّف سے اس کی دیانت داری اور سچائی کے طالب ہوتے ہیں۔ سچے اور دیانت دار افراد ہی ادب تخلیق کر سکتے ہیں۔ ادیب وہ ہے جس پر زندگی کے زخم بھی عیاں ہوں اور فکرِ رفو بھی ہو، وہ اپنی معصومیت اور بھولپن میں قلم اور کتاب کے تقاضے کو رزقِ خاک نہ بنا دے۔ اس کے اندر آگ روشن ہو تاکہ وہ اس آگ سے کیمیا گری کرے۔

مصنّف کی اندرونی سچّائی اسے حقیقت سے آشنا کرتی ہے اور وہ سچّا ادب لکھنے پر مائل ہوتا ہے۔ ایک ایسا ادب جو حقائق سے قریب ہو۔ انسان ذہنی طور پر اسی چیز کو قبول کرتا ہے جو اس کی فطرت سے قریب تر ہو سکتی ہے۔ فطرت سے مانوس حقائق ہی سچّائی میں ڈھل کر دائمی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ اس لیے مصنّف کا یہ فرض ہے کہ نتائج کے حصول میں اپنا کوئی فیصلہ دیتے وقت سچّائی اور دیانت داری سے کام لیتے ہوئے انصاف کرے۔ انصاف اسی وقت ممکن ہے جب اس کا مطالعہ بھرپور اور تحقیق کے ساتھ ہو۔ مطالعے کے ذریعے مصنّف بہت کچھ سیکھ سکتا ہے، وہ بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ مطالعہ ایک فن ہے۔ بہت کم لوگ اس بات کو سمجھتے ہیں لیکن جو لوگ مصنّف ہیں اور لکھتے رہتے ہیں انھیں خاص طور پر مطالعے کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔ مطالعہ کا انحصار دلچسپی پر ہے۔ اگر آپ دلچسپی رکھتے ہیں تو فن پارہ آپ کی توجہ کا مرکز بنے گا۔ آپ کی توجہ مطالعہ کرتے وقت جب آپ کو ماحول سے بے نیاز کر دے اور آپ مطالعہ میں کھو جائیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ہمہ تن متوجہ ہیں اور یہ توجہ جب آپ کو تسکینِ قلب اور روح کی آسودگی کے ساتھ فرحت و انبساط بخشے تو آپ تحریر یا کتاب کو سمجھ رہے ہیں جب مطالعہ کافی طوالت اختیار کر جائے اور آپ پر سنجیدگی طاری ہونے لگے تو یقیناً آپ اس مقام پر کسبِ فیض سے گزر رہے ہیں، اور آپ فیضان حاصل کر رہے ہیں۔ فیض کا جاری ہونا موضوع پر آپ کی حد سے زیادہ توجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمہ تن متوجہ ہو کر فیضاں حاصل کرنا ہی مطالعہ کا اصل فن ہے۔ توجہ اور فیضان آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہیں جو مصنّف کے لیے ضروری ہے۔

غیر افسانوی تحریریں لکھنے والوں کے لیے بہت سے مسائل درپیش ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات ان کو حل کرنا مصنّف کے لیے مشکل مرحلہ بن سکتا ہے۔ غیر افسانوی ادب چونکہ ٹھوس حقائق اور حقیقتوں پر مبنی ہوتا ہے لہٰذا کسی بھی موضوع پر لکھتے وقت اس کے پس منظر اور پیش منظر کو مدِّ نظر رکھنا اور اس کے ہر پہلو کے بارے میں جاننا، معلومات حاصل کرنا اشد ضروری ہے۔ مصنّف کو مواد

اکٹھا کرتے وقت کسی بھی رائے کو آخری یا حتمی تصور نہیں کرنا چاہیے اور مختلف پیرایوں میں کی گئی تنقید کو بھی اہم سمجھتے ہوئے ذہن میں رکھنا چاہیے۔ کسی بھی موضوع کو بغیر تنقید کے قبول نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہر طرح تنقید پر نظر رکھنا چاہیے، یہی صحت مند رویہ ہے، اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ موضوع پر کس کس انداز اور کس کس طرح سے تنقید کی گئی ہے۔ صحیح تنقید آگے بڑھنے کی دعوت بھی دیتی ہے اور مددگار بھی بنتی ہے، اگر تعمیری ہے تو پھر وہ آگاہی سے سرفراز کرے گی اور موضوع کے بارے میں مصنّف کو راسخ کام کرنے کے لیے فضا بنائے گی۔

یہ اٹل حقیقت ہے کہ افسانوی اور غیر افسانوی تحریریں لکھنے والے مصنّف اگر اپنے موضوع پر گرفت مضبوط نہ رکھ سکیں تو مصنّف کی تخلیق میں اس کی شعوری کیفیات حائل ہو سکتی ہیں۔ مصنّف اگر بہترین تخلیقات پیش کرنا چاہتا ہے تو پھر اس کو اپنے شعور و لاشعور کو ایک ٹیم کی حیثیت سے ساتھ لے کر چلنا پڑے گا تاکہ مصنّف کے ذہن میں کوئی غلط فہمی، ابہام یا الجھن پیدا نہ ہو۔ کسی بھی موضوع کے متعلق شعور اور ذہن کا صاف ہونا لازمی ہے۔

منصوبہ بندی:۔ مصنّف اگر ذہین ہے اور غور و فکر کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس کا لاشعور اس پر فیضان کا سرچشمہ فراہم کرے گا۔ یہ فیضان انسانی ذہن کی سطح پر اس وقت جاری ہوتا ہے جب وہ اس موضوع پر پوری توجہ کے ساتھ سوچ رہا ہو، موضوع پر انہماک کے اس عالم میں مصنّف کا شعور، لاشعور پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دیتا ہے اور لاشعور کے سوتے پھوٹنے لگتے ہیں۔ عرفان و آگہی کا عمل موضوع پر پڑے ہوئے تمام پردے چاک کر دیتا ہے۔ مصنّف کا لاشعور اسے فیض پہنچاتا ہے اور تحریک دیتا ہے۔ اگر مصنّف شام کو باقاعدہ کام کرنے کی منصوبہ بندی کر کے سو جائے تو یقیناً وہ صبح سویرے موضوع پر لکھ سکتا ہے۔ اور اگر مصنّف اس منصوبہ بندی سے غفلت برتے گا تو قیمتی وقت بھی ضائع ہو گا اور فیضان اور تحریک دونوں بے سود ہو کر رہ جائیں گی۔

مصنّف کے لیے منصوبہ بندی کا عمل بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ منصوبہ بندی کے نظم کو برقرار رکھے۔ اس میں دیر بھی نقصان دہ ہے اور جلدی میں کی گئی منصوبہ بندی بھی بے فیض ہستی ہے، کارگر ثابت نہیں ہوتی منصوبہ بندی کا طریقہ اگر درست ہے، موقع محل کی مناسبت کے مطابق ہے تو مصنّف کو لکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور نہ مشکل پیش آتی ہے۔ وہی تحریریں صرف جلدی میں لکھی جا سکتی ہیں جن کی منصوبہ بندی پر محنت کی گئی ہو۔ ان تحریروں میں ایک مسلسل ربط اور تسلسل ہوتا ہے ربط اور تسلسل اچھی تحریروں کے لیے نہ صرف ضروری ہے بلکہ ان کی جان ہوتا ہے۔

غیر افسانوی تحریر کے لیے نئے نئے حقائق اور مواد کی ضرورت پڑتی ہے۔ لکھنے سے پیشتر ان تحریروں کے موضوعات پر تحقیق ضروری ہے۔ موضوع سے متعلق تحقیق کا یکجا کرنا اور پھر اس سے استفادہ کرنا مصنف کے لیے ضروری ہے۔ ان تحریروں کا مواد تحقیقی ذرائع یا مختلف تحقیقی تکنیک کے ذریعے اکٹھا کیا جانا چاہیے تاکہ اس کی صحت پر کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے۔ مصنّف کو موضوع سے متعلق اس امر کا اندازہ ہونا چاہیے کہ کون سا مواد اس کے لیے سود مند ہے۔

اُردو لکھیے اُردو پڑھیے

جیون کتھا

عاصی کرنالی

میرا نام انجمن ترقی اردو ہے۔ میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئی۔ آرنلڈ نے میرے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ شبلی نے مجھے اپنے دامانِ لطیف میں لیا۔ میں خیر سے اب ۸۳ برس کی ہوں۔ لیکن قوموں، زبانوں اور تحریکوں کی عمریں روز و شب اور ماہ و سال کے پیمانے سے نہیں ماپی جاتیں۔ یہ میری بڑی بہن ہیں۔ میں انھیں آپا اردو کہتی ہوں۔ جب مجھے مولوی عبدالحق نے گود لیا تو مجھے آپا اردو ہی کے ساتھ رکھا۔ یہ خوش کہ انھیں چھوٹی بہنا مل گئی۔ میں شاد کہ مجھے آپا کی صورت میں ماں جیسی مامتا اور مولوی صاحب کی شکل میں باپ جیسی شفقت مل گئی۔ آپا اردو کی زندگی بھی عجب داستان عبرت و حیرت ہے۔ ان کی راہ حیات میں سکھ کی رُت کم آئی۔ دکھ کے موسم زیادہ آئے۔ بس ایک طویل جادۂ پُرخار اور یہ آبلہ پا مسافر۔

آپا کہتی ہیں کہ جب یہ پیدا ہوئیں تو ہر شہر و دیار کے لوگوں نے کہا۔ یہ ہماری بیٹی ہے، ہماری آنکھوں کی روشنی، ہمارے دل کی ٹھنڈک ہے۔ سندھ والے بولے اس بچّی نے ہماری وادی میں آنکھ کھولی۔ دکن والوں نے کہا اس نے ہمارے یہاں بولنا سیکھا۔ پنجاب والوں نے کہا۔ اس کا عہدِ شیر خوارگی ہمارے آنگن میں گزرا۔ دلّی والوں نے کہا۔ نامِ خدا اس بچّی نے ہمارے یہاں قدم کاٹھ نکالا۔ آپا کہتی ہیں میں خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی کہ اتنے مہربانوں کا سایہ مجھ پر ہے اور ایسی ایسی آغوشِ محبت میرے لیے وا ہے۔ ایک دفعہ آپا مجھے اپنے بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کا حال سنانے لگیں۔ یوں بھی عہدِ ماضی میرے فخر کا سرمایہ ہے۔ پورے برِصغیر میں مجھے اٹوٹ پیار ملا۔ بزرگانِ دین، صوفیائے کرام، علماء، سلاطین، رئیسوں، امیروں، سبھی نے میری قدر بڑھائی۔ اپنے اپنے علاقوں کی بولیوں ٹھولیوں اور زبانوں کی مٹھاس سے میرے کام و دہن کو شیریں کیا۔ لیکن بہنا! جب خدا قبولِ عام دیتا ہے تو موئے جلنے والے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ انسان کی مٹّی میں خیر و شر دونوں گندھے ہوئے ہیں۔ اتنا کہتے ہوئے آپا کے دہکتے چہرے پر اچانک دکھ کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ انھوں نے دل گیر لہجے میں کہا۔ موئے ہندو اور کمبخت فرنگی میری جان اور آبرو کے پیچھے پڑ گئے۔ انھوں نے میرے مقابلے پر نگوڑی ہندی کو لا کھڑا کیا۔ انقلاب زمانہ دیکھیے مجھ جیسی نجیب الطرفین، اقدارِ شرافت کے سایے میں پلنے بڑھنے والی تہذیب کے ماحول میں سنِ شعور کو پہنچنے والی نفیس طبع، لطیف مزاج بی بی اور میرا مقابلہ کس سے، بے سر و پا ہندی سے۔ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے سر سیّد کو کہ انھوں نے دست درازیوں کے اس عہدِ وحشت میں میرے ناموس کا تحفظ کیا اور مجھے بے ردا نہ ہونے دیا۔ اور کتنے ہی بزرگ اور عزیز سینہ سپر ہو کر میرے دفاع میں ڈٹ گئے اور میرے بدخواہوں کے ایک ایک وار کا توڑ کیا۔ اسمبلی میں، جلوس میں، اخباروں رسالوں میں، زبان سے، قلم سے میرے

حق میں آواز اٹھائی، ہر سیاسی حربے کو کند کیا، سبھاؤں کے جواب میں تنظیمیں بنائیں۔ ۱۹۰۰ء میں مجلس تحفظِ اردو کی نیو ڈالی۔ اللہ نواب محسن الملک کے درجات عالی کرے۔ انھوں نے کیا کیا نہ احسان مجھ پر کیے۔ ان لفظوں کو ادا کرتے ہوئے آپا اردو کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ انھوں نے فرطِ جذبات سے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا: اور پھر میری پیاری بہنا ۱۹۰۳ء میں تم پیدا ہوئیں۔ اُدھر شبلی، حبیب الرحمن شروانی، عزیز مرزا، کن کن محسنوں کا نام لوں، مجھ پر مہربان ہوئے۔ پھر وہ سب بھی تو مجھ پر احسان کرنے والے ہیں جنھوں نے نثر و نظم کے انمول جواہرات ڈھیروں ڈھیر مجھ پر نچھاور کیے اور میری خوش بختی اور عزت میں اضافہ کیا۔ تم نو سال کی تھیں کہ ۱۹۱۲ء میں اللہ نے ہمیں، ہم دونوں کو ایک ایسے مہربان بزرگ کا سایہ نصیب کیا جن کے دل میں ہمارے لیے دنیا بھر کے ماں باپ کی محبتوں کا اجالا سمٹ آیا تھا۔ یہ مولوی عبدالحق تھے۔ جن کی بیکراں چاہت کی مثال زبان و ادب کی عالمی تاریخوں اور تحریکوں میں کہیں بھی نہیں مل سکتی۔ ان کا ایثار، قربانیاں، جاں فشانیاں محبت کے ایک انوکھے تجربے کا ظہور ہیں!

ہمارے بابا جان نے، خدا ان کے مرقد کو نور سے بھرے، میری پیشانی سے مفلسی اور تہی مائگی کا داغ مٹا دیا۔ میرے اظہار و ابلاغ کے افق کو وسیع کیا۔ بابا جان نے تخلیق، تحقیق اور تنقید کی ترکیبِ باہمی سے میرے مزاج میں اعتدال اور میری شخصیت میں وقار اور نکھار پیدا کیا۔ آدمی جو کچھ کرتا ہے اپنی ناموری کے لیے کرتا ہے۔ میں بابائے اردو کے ایثار کی اس ادا کو کیا نام دوں کہ انھوں نے دوسروں کو شہرت اور بقائے دوام بخشی۔ دوسروں کو ماضی کے گوشۂ گمنامی سے نکالا۔ قدیم ادبیاتِ عالیہ کو بوسیدگی کی قبروں سے نکال کر حیاتِ تازہ عطا کی۔ ترجمے کیے۔ دوسری زبانوں کے ادب پاروں کو اردو کا حسین جامہ پہنایا۔ ہر ادبی، علمی، تحقیقی موضوع کو انھوں نے اپنے التفات سے نوازا۔ فروغِ اردو کے لیے رسالے نکالے۔ جدید سائنسی علوم و فنون کے جریدے جاری کیے۔ مکتبوں، درس گاہوں اور کتب خانوں کا اجرا کیا۔ مولوی صاحب نے کون سے پھول تھے جن سے میرے دامانِ جمال و کمال کو معمور نہیں کیا۔ جب بہن انجمن! تمھارا دفتر علیگڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہوا تو تمھیں اس وقت کی بے سروسامانی تو اب تک یاد ہوگی۔ ہے نا؟ ۔ تمھارا کُل اثاثہ ایک پرانا صندوق جو بوسیدگی کے سبب رسی سے کسا ہوا۔ اس میں ایک رجسٹر، چند پرانے مسودے، ایک قلم ایک دوات۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ پھر جب اورنگ آباد میں ۲۵ سال گزار کر تم نے ۱۹۳۸ء میں دلّی نقل مکانی کی تھی تو ماشاء اللہ کیا کیا ساز و سامان تھا کہ تمھارا جلوس کسی شہزادی کا جلوس لگتا تھا۔ یہ سب بابا جان کی ریاضتوں کا ثمرہ تھا۔ اتنا کچھ کہہ کر آپا اردو سانس لینے کو رکیں تو میں نے عرض کی۔ اور وہ سب سے بڑا احسان آپ بھول گئیں آپ پر انگشت نمائیاں ہوتی تھیں کہ آپ اتنی ادھوری ہیں کہ ذریعۂ تعلیم بن ہی نہیں سکتیں اور جدید سائنسی علوم کو آپ کی زبان مل ہی نہیں سکتی کہ انگریزی بڑی تیز طرار، رنگین زباں، شیوہ بیان ذریعۂ ابلاغ ہے، تب بابا جان کی برکت سے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں اور کراچی کے اردو کالج میں یہ حیرت انگیز اور خوش گوار تجربہ بھی ہوا اور دنیا آپ کے اس باطنی کمال کے ظہور سے حیرت زدہ رہ گئی ــــ!

یہ باتیں سنتے سنتے جانے آپا کو کیا دھیان آیا کہ ان کی خوب صورت پلکوں پر یہ موٹے موٹے آنسو دکھائی دینے لگے۔ بہ مشکل آنسو ضبط کر کے وہ بولیں: ۱۹۴۸ء کا آشوب تمھیں اب تک یاد ہوگا۔ جب ہمارے بابا جان کو ہندستان سے دیس نکالا ملا۔ نیرنگئ سیاستِ دوراں نے وہ فتنہ بیدار کیا اور وہ قیامت توڑی کہ ان کی ساری متاعِ حیات، سارا علمی خزانہ تلف ہو گیا۔ دل پر پتھر کی سِل، لبوں پر قفلِ سکوت، چہرے پر غبارِ بیکسی۔ ہمارے بابا جان تمھاری انگلی پکڑ کر اور میرا بازو تھام کر ہجرت کے سفر پہ نکلے۔ اور کراچی میں ہم خستہ دلوں، آشوب

زدوں اور آشفتہ سامانوں کی منزل بنی۔ اُس سرفروش مجاہد نے پھر کمرِ ہمت باندھی۔ تمہارے تحفظ اور میرے تشخص کے لیے پھر مستعد ہو گئے کچھ نے دستِ اعانت بڑھایا، کچھ نے بے مروّتی دکھائی۔ لیکن ان کا جہاد جاری رہا۔ وہی ترجمہ وہی تحقیق، وہی تصنیف و تالیف وہی گم شدہ ادبی سرمایے کی بازیابی، وہی ذریعۂ تعلیم کے مسائل کا حل، وہی علمی اصطلاحات کی تشکیل، وہی قدیم ماخذوں کی تلاش و تحفظ، وہی علوم و فنون کا فروغ، وہی اعلیٰ قومی درس گاہوں کا باقاعدہ اجرا، وہی اشاعتِ علم و ادب، وہی قومی یک جہتی کے استحکام کے لیے مسلسل جد و جہد۔ اور پھر ۱۹۶۱ء میں ہمارے بابا مر گئے۔ محسنِ اعظم کا سایہ اٹھ گیا۔ اس حادثے کو یاد کر کے ہم دونوں بہنیں دیر تک روتی رہیں۔ آنسو تھے کہ ساون بھادوں کی جھڑی۔ جب ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو میں نے کہا آپا! بابا جان کے اٹھنے کے بعد علم و سیاست کے افق سے وہ وہ آندھیاں اٹھیں کہ ہمارا وجود شمعِ لرزاں بن گیا۔ وہ تو خدا کی رحمت اور ہمارے بہی خواہوں کی شفقت نے فانوس بن کر حفاظت کی۔ لیکن آپا! تم بھی کیا تقدیر لکھوا کر لائی ہو کہ تمہارے دکھ کے موسم ختم ہونے ہی میں نہیں آتے۔ اُدھر ہندستان سے تمہیں دیس نکالا ملا، اِدھر کوئی علاقہ تمہیں اپنے یہاں حقوقِ شہریت دینے کو تیار نہیں ہے۔ وہاں کے ہندو تمہیں (موسلوں) کی زبان سمجھ کر تمہاری جان اور عزت کے درپے تھے۔ ادھر چالیس سال گزارنے کے باوجود تم پناہ گزیں ہو۔ جب تم پیدا ہوئی تھیں تو سب تمہیں ماں باپ کا پیار دیتے تھے اب غیر سے اپنے گھر لوٹی ہو تو تمہارے رشتہ داروں کی آنکھوں پر غیریت کے ایسے پردے پڑ گئے ہیں کہ تمہاری پہچان مشکل ہو گئی ہے۔ پھر وہاں ہندی کا سیاپا تھا۔ یہاں انگریزی کا جلاپا ہے۔ یہ موئی بوڑھی فرنگن اپنے سفید چوتے جیسے چہرے پہ غازہ تھوپ کر ہمارے انگریز پرست جوان مردوں کے ذہنوں میں دامِ فریب بچھائے بیٹھی ہے۔ ایک مقتدر طبقہ اس عروسِ ہزار داماد کے غمزوں پر ہزار جان سے فدا ہے۔ اور آپا، تمہاری تذلیل و تحقیر میں یہ ناقدرے لوگ سرگرم ہیں۔ ادھر کوئی علاقہ تمہیں قبول کرنے کو تیار نہیں۔ تم تو ایک گلدستہ تھیں اور سبھی نے اپنے اپنے گلہائے رنگ رنگ سے تمہاری تشکیل اور تزئین کی تھی۔ سندھی، پنجابی، سرائیکی، بلوچی، پشتو، ڈھیر سارے پھولوں، رنگوں اور خوشبوؤں کے امتزاج کا نام اُردو ہے۔ ساری کرنیں، سارے اجالے مل کر ایک اجتماعی تہذیب و ثقافت کے سورج کو طلوع بخشتے ہیں اور قومی تشخص جگمگانے لگتا ہے!

ارے آپا! تم پھر رونے لگیں۔ آؤ دونوں گلے مل کر جی بھر کر رو لیں کہ ہم اپنے وطن میں اجنبی ہیں اور رشتوں کی حرمتیں غبارِ بے مروّتی میں گم ہو چکی ہیں!

طنزیات و مقالات

از: سیّد محفوظ علی بدایونی ـ مولف: محمد محی الدین بدایونی بی اے

قیمت: بیس روپے

انجمنِ ترقیِ اُردو پاکستان۔ بابائے اُردو روڈ، کراچی ۱

اُردو گنتی کے چند پہلو

افضال احمد

یہ مضمون جناب افضال احمد صاحب کے گہرے غور وفکر کا نتیجہ ہے اور نہ صرف اُردو داں طبقہ کے لیے بلکہ اُن حضرات کے لیے بھی بے حد فکر انگیز ہے جو اُردو زبان کو حقیر کہہ کر اس کے سیکھنے کو اپنے لیے توہین قرار دیتے ہیں۔ دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی دہائی کے بعد کی گنتی کے نام اس طرح لیے جاتے ہیں جیسے ہمارے یہاں بچّے اُن کو سمجھنے کے لیے دہائیوں میں ایک سے نو تک کے ہندسوں کو جوڑ کر پڑھتے ہیں۔ مثلاً بیس کے بعد وہ کہتے ہیں۔ بیس ایک، اکیس۔ بیس دو، بائیس، وغیرہ۔ دنیا کی لنگوا فرنیکا انگریزی کو دیکھ لیجیے۔ اکیس اور بائیس وغیرہ کے لیے مرکّب الفاظ ONE - TWENTY اور TWO - TWENTY استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ پُرلطف چیز ہمیں یورپ کی فیشن ایبل زبان فرانسیسی میں دکھائی دیتی ہے۔ وہاں اُنسٹھ تک تو اعداد کا سلسلہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح چلتا ہے۔ لیکن اِس زبان میں ستّر کے لیے کوئی علاحدہ لفظ نہیں ہے بلکہ ستّر کو ساٹھ۔ دس (SOIX ANTE - DIX) کہا جاتا ہے۔ پھر اکہتّر کے لیے ساٹھ اور گیارہ (SOIX ANTE ET ONXE) اور اُناسی کے لیے ساٹھ۔ دس۔ نو (SOIXANTE - DIX - NEUF) کے الفاظ کام میں لائے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ دل چسپ چیز ہمیں اسی کے عدد میں دکھائی دیتی ہے۔ اس عدد کے لیے فرانسیسی میں لفظ ہے QUATRE - VINGTS جس کا ترجمہ ہوگا "بیس کا چار گنا"، ہمارے یہاں کسی زمانے میں بے پڑھے لکھے لوگ چار بیسی کہا کرتے تھے۔ چنانچہ فرانسیسی لفظ QUATRE - VINGTS کا ٹھیٹھ اُردو ترجمہ ہوا "چار بیسی"، اس کے بعد کی گنتی کے لیے چار بیسی اور ایک چار بیسی دس، چار بیسی گیارہ اور ننانوے کے لیے چار بیسی دس۔ نو (QUATRE - VIGTS - DIX - NEUF) ہے۔ ممکن ہے دانشور حضرات اس میں بھی کوئی خوبی تلاش کرلیں۔ لیکن غیر جانبدار ہو کر غور کریں تو محسوس ہوگا کہ یہ چیز فرانسیسی کی بالخصوص اور دیگر زبانوں کی بالعموم عدم پختگی پر دلالت کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اُردو کی گنتی پر غور کریں تو اس میں ہمیں دکھائی دے گا کہ اکیس، بائیس وغیرہ مرکّب الفاظ ہیں۔ لیکن اُن کے اجزا آپس میں اس طرح گھُل مل گئے ہیں کہ وہ مفرد الفاظ معلوم ہونے لگے ہیں اور اب محسوس ہونے لگا ہے کہ ہر عدد کے لیے ایک علاحدہ نام ہے۔ ہمارے دانشور فیصلہ کریں کہ کیا یہ چیز اُردو زبان کی عدم پختگی پر دلالت کرتی ہے یا پختگی اور ترقی یافتہ ہونے پر؟ بہر حال افضال صاحب کے خیالات آپ کے سامنے ہیں اور قومی زبان کے صفحات اُن تمام مباحث کے لیے حاضر ہیں جو اِس مضمون سے ابھرتے ہیں۔

(ادارہ)

کچھ مدّت ہوئی ایک جرمن کو اُردو پڑھانے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ المنادری صاحب ایک مشنری اسپتال میں طبیب تھے۔ اُن کو صرف سلام چلاؤ، اور بول چال کی اُردو درکار تھی۔ مریضوں سے بات چیت کی حد تک۔ اس سلسلے میں میں نے اُن کو گنتی بھی سکھائی تھی۔ اس وقت تک

مجھے صرف بچپن سے رٹی رٹائی گنتی یاد تھی۔ اس پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔

ظاہر ہے گھٹی میں پڑی ہوئی گنتی پر غور کرنے کا خیال بھی کبھی کیوں آنے لگا تھا۔ پہلی بار کسی غیر زبان والے کو پڑھایا تو ان اصولوں کی طرف توجہ گئی جو ہماری گنتی میں مضمر ہیں۔ اور وہ بھی اس لیے کہ ذرا جوشِ تعلیم میں کسی یورپی کو ہر گنتی کا نام بتانے، سمجھانے لگا تھا۔ اور اسی سبب سے ذرا زیادہ ہی زور لگا دیا تھا۔

اپنی شرمندگی کا اظہار کرتا چلوں کہ مجھے پہلی بار نظر آیا کہ ہماری گنتی میں بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اور عام طور پر بنیادی یہ وہی اصول ہیں جو انگریزی گنتی میں کارفرما ہیں۔ مثلاً ایک سے نو تک ہر گنتی مفرد ہے، جیسا کہ اُن کے ناموں سے ہی ظاہر ہے۔ یا کم سے کم مجھے پتہ نہیں چل سکا کہ ہم ایک کو ایک اور پانچ کو پانچ کیوں کہتے ہیں۔ اور انگریز ٹو کو ٹو اور نائین کو نائین کیوں کہتے ہیں۔

البتّہ دس کے متعلق مجھے شبہ ہے کہ یہ انگریزی ٹین کے برخلاف مرکّب ہے۔ مگر ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ دس کے آگے کی گنتی کی ہر دہے میں سو تک، پچھلی دہائی کے نام میں پہلی دہائی کے کسی مفرد کو ملا کر ایک نیا عدد بنا لیتے ہیں۔ بالکل انگریزی کی طرح۔ مثلاً انگریزی میں اکیس (۲۱) کو ٹونٹی ون کہتے ہیں تو یہ اکیس بھی دراصل "ایک بیس" ہے جو لسانی تقاضوں کے تحت کثرتِ استعمال سے بگڑ کر اکیس بن گیا ہے۔

مگر کیوں نہ بات شروع ہی سے کی جائے؟ یہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ ایک سے لے کر نو تک تمام ہندسے مفرد ہیں البتّہ ہم ان اعداد کی وجہ تسمیہ نہیں جانتے۔ ہاں یہ اور کہتے چلیں کہ ہماری ساری کی ساری گنتی بنیادی طور پر ہماری قدیم پراکرتوں سے ابھری ہے۔ اردو زبان ہی کی طرح۔ اور جیسا ہم آگے دیکھیں گے، ہماری گنتی کے اس اخذ و اختیار کی کارفرمائی کسی ایک قدیم بولی پر بس نہیں۔

اب آیئے اپنی گنتی کے مفردات کو ایک ایک کر کے دیکھیں۔

پہلے تو یہ "ایک" ہی ہے۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ ہم ایک کو ایک کیوں کہتے ہیں مگر ایک بات البتّہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہم اس "ایک" کو فارسی کے زیرِ اثر کہیں کہیں "اک" اور "یک" بھی کہہ جاتے ہیں۔ یہ بھی شبہ ہوتا ہے کہ پہلے اس کے لیے اِکّا اور اِکّی بھی استعمال ہوتا تھا۔ ہمارے تاش میں اِکّا اب بھی ہوتا ہے۔

دو کا لفظ ہم نے البتّہ فارسی ہی سے لیا ہے ورنہ شاید ہماری گنتی میں اس کا پُرانا نام وہی تھا جو ہماری طرف کی بعض دوسری زبانوں میں ملتا ہے۔ یعنی "بُو"، سندھی، گجراتی اور میمنی "بُو"، اس کے گواہ ہیں۔ اس بات کی اہمیت یہ ہے کہ جیسا ہم آگے دیکھیں گے۔ یہ "دو" ہماری گنتی میں پھر کہیں اور نہیں آتا۔ دو سو اور دو ہزار وغیرہ میں بھی یہ دو، دو ہی کی طرح ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں جہاں کسی مرکّب ہندسے میں اس کو آنا ہوتا ہے تو یہاں اس کا نام دو نہیں ہوتا "بُو"، یا اس کی بدلی ہوئی شکل ہوتا ہے۔ مثلاً دس دو بارہ۔ بیس دو بائیس یا ساٹھ دو باسٹھ۔

اب لیجیے تین۔ شاید یہ لفظ "تے"، بلکہ "ترے"، تھا۔ ہماری ہم خاندان زبانوں میں یہ "ترے"، اور "تری"، ان ہی معنوں میں آج بھی موجود ہے۔ بلکہ اردو کے ترسول اور تراہے میں تو صرف "تر" اور "تِ"، رہ گیا ہے۔

اب چار۔ یہ چار تو خیر ہے ہی۔ مگر چَو کی صورت میں باقی گنتی بھر میں بلکہ خود عام زبان میں بھی یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ مثلاً چوبیس، چوہتّر، چوکا، چوراہا وغیرہ۔

پانچ۔ ایسا لگتا ہے کہ پہلے یہ صرف پنج تھا۔ جیسے پنج تنتر میں۔ پنچائت اور پنچائتی پنچ اور سرپنچ میں۔ فارسی کا پنج بھی یہی پنج ہے۔

لیکن یہ پنج کہیں کہیں گھس گھسا کر صرف پچ رہ گیا ہے۔ مثلاً پچ میل میں، پچیس میں۔ گنتی میں یہ پنج کہیں کہیں صرف پئیں بھی ہو کر رہ گیا ہے۔ مثلاً پینتالیس میں، پینتیس میں۔ لفظ پانچ ایک آدھ جگہ صرف پان بھی ہو کر آیا ہے۔ مثلاً پانسو میں، پانسیر میں۔ پندرہ کے عدد میں تو یہ صرف پن یا پند بن کر رہ گیا ہے۔

اور یہ ہمارا چھ۔ عام طور پر اسے زیر کے ساتھ بولتے ہیں مگر زبر کے ساتھ بھی بہ کثرت سنا گیا ہے۔ اور بعض بعض جگہ پیش کے ساتھ بھی۔ پوری گنتی پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ کئی جگہ یہ صرف "س" ہو کر رہ گیا ہے۔ جیسے بچے "س" کو چھ اور چھ کو "س" سے ادل بدل کر لیتے ہیں۔ مثلاً دس چھ سولہا۔ چھولہ نہیں۔ ساٹھ، ساٹھ ہے چھاٹھ نہیں۔ یہ بات جب ہم ساٹھ جمع کی بات کریں گے تو کھل کر دیکھیں گے۔

اب آیئے سات پر۔ یہ آگے کی گنتی میں صرف "ست" رہ جاتا ہے۔ مثلاً سترہ میں، ستائیس میں، ستانوے میں بلکہ ایک جگہ تو صرف "س" ہو کر۔ بلکہ ستر جمع میں یہ "س" بھی "ٹ" میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کی تفصیل اس کے اپنے موقع پر آئے گی۔

اسی طرح آٹھ۔ یہ مفرد کے علاوہ ہر جگہ بنیاداً اٹھ کی صورت میں آتا ہے۔

یہاں رُک کر ایک اور بات پر غور کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہمارے مفردات میں جہاں جہاں کھنچا ہوا الف بیچ میں آتا ہے وہ مرکبات میں گر جاتا ہے۔ مثلاً پانچ، پنچ یا صرف پچ رہ جاتا ہے۔ سات "ست"، اور آٹھ "اٹھ" بن جاتے ہیں۔ تو شبہ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اولاً یہاں یہ الف تھا ہی نہیں۔ اور ہم ولائیتیوں نے بعد میں لگا لیا۔

اب آخر میں نو۔ یہ فارسی کے "نہ" سے ملتا جلتا نام یوں کا یونہی رہتا ہے۔

اکائیاں پوری ہوئیں تو اب تمام کی تمام دہائیوں کا ذکر ایک ہی دفعہ میں ہو جائے۔ دس کی کچھ بات تو ہم خیر سے شروع ہی میں کر چکے ہیں۔ اب باقی "پوری" دہائیوں پر غور کر لیں۔ شبہ ہوتا ہے کہ یہ سب کی سب مرکب ہیں۔ بلکہ شاید خود دس بھی انگریزی "ٹین" کے برخلاف مرکب ہی ہے۔ شاید د، اور س سے مل کر بنا ہے۔ اور غالباً اس "س" کا مطلب ہے ضرب دس۔ یعنی خود دس بھی ایک ضرب دس* ہوا۔ (*: یہاں یہ دس ہمارا آج کا دس ہے نو جمع ایک والا۔ مجبوراً استعمال کر رہا ہوں کہ ورنہ کیا کروں) یہ س شاید اہی ہس یعنی الیس تھا۔ بہر حال۔

یہ بات ذرا الجھی کی الجھی سی رہتی ہے۔ لیکن جب ہم باقی "پوری" دہائیوں کو دیکھیں گے تو بات ذرا صاف ہونے لگے گی۔

پہلے تو یہ د۔ یا تو یہ کسی طرح ایک کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور س کے معنی دس گنا یعنی ضرب دس کے ہیں تو "دس" کے معنی ہوئے ایک ضرب دس۔ دس بار ایک۔ یا پھر یہ آواز پشتو اور انگریزی کی طرح انفرادیت جتانے اور زور دینے کے لیے آتی تھی۔

اور س منفرد تھا تو دہائی کے لیے یعنی دس کو یہ سمجھ لیجیے کہ اصلی اور بنیادی مفرد عدد جو نو کے بعد آتا ہے۔ اصلی یعنی بعد میں آنے والی دہائی کے برخلاف مفرد۔ یعنی دس برابر ہے انگریزی دی ٹین کے۔

آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ یہ لفظ دس کہیں کہیں "رہ" میں بھی بدل جاتا ہے۔

باقی "پوری" دہائیوں کو دیکھ لیجیے۔ یہ "بو" جمع "س" ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ بلکہ "بو" اور "الیس" کی۔ یعنی "بوالیس"۔ یہ "بو" اب کثرتِ استعمال سے صرف "ب" رہ گیا ہے۔ یعنی "بوالیس" بیس ہو گیا ہے۔

اسی طرح تیس ۳۰ بھی تین ضرب دس ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ "تے" غالباً "ترے" تھا۔ بلکہ "تی" ہمارا تین اسی تے کی ترقی یافتہ

شکل ہے چنانچہ یہ تینس بھی تے ضرب الیس یا تی ضرب سی ہی کی ایک شکل ہے۔

اب آیئے چالیس پر۔ یعنی بنا تو چار ضرب الیس ہی سے ہے مگر اس کا "چار" ذرا لسانی ضرورتوں کے تحت "چال" ہو گیا ہے۔ اردو کے علاوہ بھی ہماری بعض دوسری زبانوں میں کئی جگہ رے کو لام کی آواز میں بدل لیتے ہیں۔ شاید فطری ہے۔ بچے بھی یہی کرتے ہیں۔

اور اب پچاس۔ یعنی دس پنجے۔ یا پانچ ضرب دس۔ اپنی بنیادی شکل میں ہوتا تو پنج بلکہ پنج ضرب الیس (ای س)۔ لیکن غالباً اس لیے کہ ایک عدد پچیس پہلے ہی بیس جمع پانچ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہ ممکنہ "ا ی س" آس میں بدل گیا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کسی نہ معلوم وجہ سے چالیس کے بعد "ضرب ا ی س" کا اصول ہی کام میں نہ آرہا ہو۔ مثلاً پچاس کے بعد ساٹھ پھر ستّر پھر اسّی اور پھر نوّے۔ اس اصول سے کوئی لگا کھاتے نظر نہیں آتے۔ مگر ان کا ذکر ذرا آگے۔

اب ساٹھ۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ ساٹھ میں "س" کو "چھ" ہونا چاہیے تھا مگر "چھ" "سین" کبھی کبھی آپس میں بدل بھی جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ "چھ ضرب دس" چھاٹھ کے بجائے ساٹھ ہو گیا ہے۔

خیر یہ ساٹھ کا "س" سین تو سمجھ میں آگیا مگر یہ نام کا دُم سرا آٹھ کہاں سے آگیا؟ اور یہ "سین ضرب دس" ساٹھ کیسے بن گیا؟ خاص کر جب کہ یہ "آٹھ" ہمارے سات جمع ایک والا آٹھ بھی نہیں ہے۔ تو میرا گمان ہے کہ یہ پچاس ہی کے انداز پر شروع میں "ساس" رہا ہو گا۔ لیکن چونکہ ایک طرف تو ہماری طرف یہ لفظ ایک رشتے کا نام ہے۔ اور ہماری ساس ایک اور ہی شے ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف یہ بھی کہ لسانیات بلکہ تلفظات کے بعض قدرتی تقاضوں کے تحت یہ لفظ "ساس" منہ میں لوٹتے لوٹتے ساٹھ بن گیا۔

اب ستّر کو لیتے ہیں۔ عرض کر چکا ہوں کہ مرکبات میں سات، ست رہ جاتا ہے۔ تو اگر کسی سبب سے دس کے لیے "تر" کا لاحقہ آرہا ہو تو ست، اور تر مل کر ستّر بن جائیں گے

اس کے علاوہ ایک اضافی خیال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ ستّر جب آگے مرکبات میں آتا ہے تو اس کا "س" کسی نہ معلوم لسانی قلابازی کے سبب "ہ" کی آواز دینے لگتا ہے اور ستّر، ہتّر بن جاتا ہے۔ مثلاً اکہتّر، بہتّر، تہتّر، اٹھہتّر وغیرہ۔

اب رہا اسّی۔ تو اس میں تو صاف "اس" صاف "اٹھ" کی لسانی طور پر سڈول کی ہوئی آواز ہے۔ اسّی یعنی اٹھی۔ یہاں بھی پچاس، ساٹھ اور ستّر کی طرح "ی س" کا لاحقہ موجود نہیں۔ کیوں؟ پتہ نہیں۔

یا شاید اسے بھی اٹھ جمع ی س (یعنی آٹھ ضرب ی س یعنی دس) ہونا تھا۔ یعنی اٹھّیس۔ مگر یہ اٹھّیس یا اڑتیس پہلے ہی موجود تھا۔ خیر ممکن ہے کہ ہماری موجودہ گنتی برصغیر کی صرف کسی ایک ہی پراکرت سے ابھر کر نہ آئی ہو۔ بلکہ یہ خود مادرِ اردو ہی کی طرح کئی مختلف پراکرتوں کی کھچڑی ہو۔ یعنی کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا لے کر لسانی اور تاریخی ارتقا نے بھان متی کا کنبہ جوڑ لیا ہو جسے ہم آج اپنی گنتی کہتے ہیں۔ یعنی کسی بولی میں دس گنا بتانے کے لیے "ی س" یا "ای س" کا لاحقہ استعمال ہوتا تھا تو کہیں کوئی اور اصول کارفرما تھا۔ شاید چالیس کے بعد پچاس اور ساٹھ کسی اور بھی زبان کی گنتی ہو اور ہتّر اسّی نوّے کن ہی اور زبانوں کے خاندانی نام ہوں۔ کیا خبر۔

خیر، اب نوّے کی خبر لی جائے۔ سیدھا سادا نام ہے مگر اس کا ایک اہم پہلو اس کا دکنی تلفظ ہے۔ اہلِ دکن اس نوّے کو "نوَد" کہتے ہیں۔ چنانچہ پھر وہ اکانوے کو "اِکانوَد" اور بیانوے کو "بیانوَد" بھی کہتے ہیں۔

میں نے اس حیدر آبادی تلفظ کا ذکر ایک خاص سبب سے کیا ہے۔ ایک جگہ میرے لیے اس کی اہمیت اچانک کلیدی ہو جاتی ہے۔

یعنی غیر حیدرآبادی اور غیر دکنی اردو میں۔ مگر اس کا ذکر بھی آگے۔

نوّے کے بعد سو اور سو کے بعد ہزار، لاکھ، کروڑ، ارب، کھرب، سنکھ اور مہا سنکھ ہماری گنتی کے اہم موڑ ہوتے ہیں۔ بڑی وسیع گنتی ہے ہماری۔

اس کے علاوہ ہم مسلمانوں کے ایک عظیم سائنسداں اور ریاضی داں الخوارزمی نے جہاں علم الحساب کو اور کئی بیش بہا اور ان مِٹ سوغاتیں دی ہیں وہاں دنیا کو صفر بھی عنایت فرمایا ہے۔ عربوں نے علم الحساب اہلِ ہند سے لیا تھا۔ چنانچہ اعداد ہی کو ہندسہ کہہ کر اس کا بر ملا اعتراف بھی کیا۔ لیکن اہلِ ہند کے پاس صفر نہ تھا اور نہ ہی وہ اس کی اہمیت سے واقف تھے۔ وہ تو اس کا خانہ خالی ہی چھوڑ دیا کرتے تھے۔ الخوارزمی نے اس کو بطور ہندسہ استعمال کر کے نہ صرف علم الحساب بلکہ دنیائے سائنس میں انقلاب برپا کر دیا۔ اہلِ ہند نے پہلی بار اجین میں اسے اس وقت استعمال کیا جب الخوارزمی کو اسے کام میں لائے ہوئے ۷۸ برس گزر چکے تھے۔

اور جب بات کسی اور رستے پر پڑ ہی گئی ہے تو واپس لوٹنے سے پہلے ایک بار یہ بھی یاد کرتا چلوں کہ ہماری گنتی بنیادی طور پر اعشاری ہے۔ مغرب سے مرعوب ہو کر سو ہزار اور چار سو کروڑ کہنے والوں کو شاید وقوف نہیں۔

اچھّا اب ایک بار پھر واپس اپنی گنتی پر۔

ہم اکائیوں کے ناموں پر غور کر چکے۔ "پوری" دہائیاں دیکھ ڈالیں۔ اب پلٹ کر ان دہوں کو سمجھتے چلیں جو دس سے پورم پور تقسیم نہیں کی جاسکتی۔ اس میں دوسرے دَہے کی گنتی سرِ فہرست ہے۔

میں نے شبہ ظاہر کیا تھا کہ "دس" کو شاید "دہ" بھی کہتے ہوں گے۔ میرا مطلب فارسی سے نہیں اپنی پراکرتوں سے ہے۔ میں نے تو یہ بھی سوچا تھا کہ شاید "دہ"، "دہ" بھی بولا جاتا ہوگا۔ میرا شبہ گیارہ وغیرہ کی وجہ سے ہوا تھا۔

دس ایک، گیارہ۔ یہ شاید پہلے اکارہ تھا۔ اِکا سے اِکیّا ہوا۔ پھر اِکیّا کا کاف منہ کھُل کر اور نرم پڑ کر گاف بن گیا اور گیارہ ہو گیا۔ بعد میں ہم نے شروع کا الف بھی گرا دیا کہ ہم افلاطون تک کے ساتھ یہی کر گزرتے ہیں اور اسے "فلاطوں" بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ اکیّارہ، گیارہ رہ گیا۔ جب یہ الف گرا تو گویا اپنے ساتھ ایک گاف بھی لے ڈوبا۔ ویسے اب بھی بہت سے لوگ اِگیّارہ کہتے ہیں۔

اسی طرح بارہ "بورہ" کی ہی شکل ہے۔ تیرہ تو ہے ہی "تِنے رہ"۔ چودھا میں البتّہ "رَہ" کے بجائے "دَہ" استعمال میں آتا ہے۔ پندرہ "پنچ رہ" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

پھر سولہا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسے "چھولہا" ہونا چاہیے تھا۔ یعنی دس چھ چھولہا مگر ہو گیا سولہا۔

پھر "سات رہ" سترہ ہو گیا اور "اٹھ رہ" اٹھّارہ۔ یا اٹھّارا کہہ لیجئے۔ اب رہا انیس، تو اس کا قصّہ الگ ہے اور قیامت کا ہے۔ سو ذرا آگے۔ اور یہ صرف انّیس ہی کی بات نہ ہو گی بلکہ انتالیس، انچاس، انسٹھ، انہتّر، نواسی اور ننانوے کی بات ہو گی۔ سو انتظار فرمائیے۔ پہلے تیسری دہائی۔

بیس ایک، اکیس[۲۱] آپ پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ اب بائیس[۲۲] پر غور فرمالیں۔ یہ "بوبیس" کی جدید ترین شکل ہے۔ تیئس[۲۳] "تے بیس" تھا۔ چوبیس[۲۴] تو خیر ہے ہی چو بیس۔ پچ بیس بھی ظاہر ہے۔ اور چھ بیس، سات بیس اور آٹھ بیس بھی ہر جگہ بیس گھس کر یا تو اس (ا ی س) ہو گیا ہے یا چھبّیس کی طرح مشدّد ہو کر موجود ہے۔

اسی طرح اکتیس، بتیس، تینتیس، چونتیس، پینتیس، چھتیس، سینتیس اور اٹھتیس ہیں۔ یہاں بتّیس اور چھتّیس میں تیس کی "ت" مشدد ہوئی۔ اور تین، چار، پانچ اور سات کے ساتھ نون غنّہ آگیا۔ تینتیس، سینتیس وغیرہ۔ اڑتیس میں البتہ اٹھ۔ اڑ بن گیا گو اب بھی بہت سے علاقائی لفظوں میں یہ دستور "اٹھتّیس" ہے۔ تشدید کے ساتھ۔

اب آئیے چالیس کے معاملے پر۔ یہ مرکّب میں تالیس اور آلیس ہو جاتا ہے۔ مثلاً اکتالیس، ایک چالیس تھا۔ بیالیس۔ بو چالیس تھا۔ اسی طرح تینتالیس، چوالیس۔ جسے بہت سے لوگ آج بھی چوتالیس کہتے ہیں۔ اڑتیس میں اڑ، اٹھ کا صوتی بدل ہے۔

ہاں پچاس ایک کا قصّہ مختلف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری کسی پرانی پراکرت میں پچاس کو "ون" کہتے تھے اور ہم نے اسے ادھار لے لیا۔ چنانچہ پچاس ایک ہوا "اکاون"، جسے اکیاون بھی کہتے ہیں۔ ایسے ہی "بوون" یعنی باون۔ ترے ون، جو آج ترپن ہے۔ چوون، یعنی چوّن۔ پچ ون، یعنی پچپن۔ چھپّن۔ ستّاون اور اٹھّاون۔

اسی طرح اِسٹھ۔ باسٹھ۔ ترے سٹھ۔ چونسٹھ۔ پینسٹھ۔ چھیاسٹھ۔ سڑسٹھ۔ یعنی ست سٹھ اور اسی طرح اڑسٹھ یعنی اٹھّ سٹھ پھر اکہتر۔ بہتّر۔ تہتر۔ چوہتر۔ پچہتّر۔ چھیتّر (چھہتّر) ستتّر، یعنی ست ہتّر اور اٹھہتّر۔ یاد رہے کہ "ہتّر"، غالباً ستّر کا ہی دوسرا تلفظ ہے۔

اس کے بعد اکیّاسی، بیاسی، تراسی، چوراسی، پچاسی، چھیاسی، ستاسی اور اٹھاسی۔ سب اسّی میں مفردات کی شمولیت سے پیدا ہوئے ہیں۔

اکیانوے، بانوے، ترانوے، چورانوے، پچانوے، چھیانوے، ستانوے اور اٹھّانوے بھی سمجھ میں آگئے جنھیں اہلِ حیدر آباد (دکن) اکیّا نوّد، بیا نوّد سے لے کر ننانوّد تک کہتے ہیں۔

اب وہ بات جس کے لیے میں نے اس حیدر آبادی تلفّظ کو ایک جگہ کلیدی اہمیت کا بتایا ہے۔

میں نے جملہ گنتی کا ذکر کیا مگر انیس، انتیس، انتالیس، انچاس، انسٹھ، انہتر، اناسی اور ننانوے کا ذکر نہیں کیا اور کہہ دیا کہ آگے۔ سو وہ اب سنئے۔

ہماری اردو گنتی میں ایک بات ایسی قیامت کی ہے کہ ہماری طرف کے علاوہ شاید دنیا کی کسی اور گنتی میں نہ ملے، اور وہ ہے "نفی ایک" کا تصوّر۔ ہمارے ہاں اس ایک "نفی ایک" کے لیے ایک واضح علامت موجود ہے اور وہ ہے "اُن"۔ مثلاً ہم اٹھّارہ کے بعد دس جمع نو کو "بیس نفی ایک" کہتے ہیں۔ یعنی "اُن بیس"۔ "ایک کم بیس"، یہی اُن بیس گھس کر انیّس رہ گیا ہے۔

اسی اصول پر انتیس۔ ان تالیس۔ انچاس۔ انسٹھ۔ انہتّر اور اناسی کے اعداد ہیں۔

لیکن اٹھّاسی کے بعد اسّی اور نو مل کر نواسی کہلاتے ہیں۔ تو یہاں وہ "اُن"، یعنی "نفی ایک"، والا اصول کہاں گیا؟ یہی وہ جگہ ہے جہاں مجھے اپنے دکنی رفیق یاد آتے ہیں۔ وہ اس نواسی کو "اُنّ نوّد"، کہتے ہیں۔ نوّد یعنی نوّے۔ تو یہ اُنّ نوّد در اصل اُنّ نوّے ہوا۔ یعنی نوّے نفی ایک۔ ایک کم نوّے۔

سندھی میں بھی نفی ایک والا اصول نوّے کے ساتھ کار فرما ہے۔ اس زبان میں ہمارے نواسی کو اُنانوے کہتے ہیں، یعنی اُنّ نوّے۔ نواسی کے بعد نو اور اسی والے قاعدے (یا بے قاعدگی) کے مطابق نو اور نوّے مل کر ننانوے ہو جاتا ہے۔ شاید کسی نہ معلوم

سبب سے یہاں "اُنِّ سو" غلط ہو جاتا۔ یا کیا پتہ کسی مقامی بولی میں آج بھی اُنِّ سو یا اسی سے ملتی جلتی کوئی بات موجود ہو جس کی مجھ عاجز کو خبر نہ ہو سکی ہو۔

یہاں واضح کرتا چلوں کہ یہ "نفی ایک" صفر سے نفی ایک کے معنی میں نہیں ہے یہاں یہ صرف "ایک کم" کے لیے استعمال ہوا ہے۔ صفر سے کم کے اعداد کا تصور تو بہت بعد کا ہے۔

بہر حال یہ ہی میرے چند خیالات جو ضروری نہیں کہ درست ہوں۔ لیکن اِن کو پڑھ کر اگر کسی مجھ سے بہتر کے جی میں کوئی اور بات آجائے اور وہ اسے لکھ کر شائع کرا دے تو یہ اُردو کی بڑی خدمت ہوگی اور مجھے بھی یہ اطمینان ہو جائے گا کہ میری ناقص تحریر رائیگاں نہیں گئی۔

اردو کے عظیم شاعر

میر

کے بارے میں ایک اہم تحقیقی و تنقیدی کتاب

محمد تقی میر

مصنفہ

ڈاکٹر جمیل جالبی

قیمت:۔ پچیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بجائے اردو روڈ کراچی ۱

پیش رفت

تہران میں علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت

ڈاکٹر کلیم سہسرامی

جمہوری اسلامی ایران کی وزارتِ ارشادِ اسلامی اور تہران یونیورسٹی کے تعاون سے علامہ اقبال کے ایک سو آٹھویں جشن پیدائش کے موقعے پر ایک بین الاقوامی سیمینار تہران یونیورسٹی کے فردوسی ہال میں منعقد ہوا۔

اس سیمینار میں جن حضرات نے شرکت کی ان میں پاکستان سے ڈاکٹر جاوید اقبال (چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ) ڈاکٹر عبدالشکور احسن، (ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات پاکستان پنجاب یونیورسٹی) پروفیسر محمد منور (ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی لاہور) ڈاکٹر سید محمد اکرم (پرنسپل اورینٹل کالج، صدر شعبۂ فارسی و ڈین آف اسلامک ٹریننگ پنجاب یونیورسٹی) مسٹر محمد سہیل (ڈپٹی ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی، لاہور) ڈاکٹر خانم شہین دخت مقدم صفیاری (ریسرچ اسکالر اقبال اکیڈمی، لاہور) ہندستان سے پروفیسر سید امیر حسن عابدی اور پروفیسر نورالحسن انصاری (دہلی یونیورسٹی) بنگلہ دیش سے پروفیسر کلیم سہسرامی (صدر شعبۂ السنہ راجشاہی یونیورسٹی) لبنان سے ڈاکٹر عبداللہ خالدی (لبنان یونیورسٹی) اور شام سے ڈاکٹر علی حسون تھے۔

۱۰ مارچ ۱۹۸۶ء کو اس سیمینار کا آغاز سہ پہر کے وقت تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر جاوید اقبال تھے۔ پروگرام کی تفصیل کے بعد ایران کا قومی ترانہ ساز و آہنگ کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد تہران یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر حسین فردتن نے استقبالیہ خطبے میں علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اقبال شناس حضرات کا خیر مقدم کیا۔ پھر سیمینار کمیٹی کے سکریٹری اور تہران یونیورسٹی کے ڈین آف لیٹرز ڈاکٹر جلال الدین مجتبوی نے اپنی رپورٹ پیش کی اور علامہ اقبال پر سیمینار کے انعقاد کی غرض و غایت بیان کی، انھوں نے حاضرینِ جلسہ خصوصاً غیر ملکی نمائندوں کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے طویل مسافت طے کرکے اس سیمینار کو اپنی شرکت سے کامیاب بنایا۔

اس کے بعد حجتہ الاسلام والمسلمین جناب سید علی خامنہ ای صدر جمہوری اسلامی نے اپنی افتتاحی تقریر میں مسلمانوں کے زوال اور نکبت و افلاس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے دنیائے اسلام خصوصاً پاک و ہند میں ان کے عروج دارتقا سے بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال کے نظریات و خیالات کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ دنیائے اسلام کے اتحاد اور مرکزیت کے لیے علامہ اقبال نے جو پیشین گوئی کی تھی آج اس کی تعبیر ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس بے مثال مفکر کے اقوال و افکار پر عمل کریں۔ اگر مسلمان قومیں بیدار ہو گئیں تو ان شاء اللہ بقول اقبال "مشرق کا جنیوا تہران ہو گا" گویا یہ بھی اقبال کے الہامی افکار کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔ صدر محترم

نے مزید فرمایا کہ علامہ اقبال کو صحیح معنوں میں خراجِ عقیدت پیش کرنے اور ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے وزارتِ تعلیم کو چاہیے کہ کسی یونیورسٹی یا کسی ہال کو ان کے نام سے منسوب کیا جائے۔ ایران نے گزشتہ چند برسوں میں جو اسلامی انقلاب برپا کیا ہے وہ بھی دراصل اقبال کے خواب کی تعبیر کا ایک پرتو ہے۔ دراصل ایسا اسلامی مفکر برسوں میں پیدا ہوتا ہے۔ آخر میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی مختصر مگر جامع اور پُر اثر تقریر میں صدر محترم جمہوری اسلامی ایران کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے علامہ اقبال کے پیام کی جس انداز میں تفسیر و تشریح کی ہے وہ دنیائے اسلام کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ اگر اسی طرح دوسرے اسلامی ممالک کے سربراہ بھی اقبال کے گفتار و اظہار کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنالیں تو مسلمانوں کی ترقی کی راہیں کھل جائیں۔

دوسرے دن ۱۱ مارچ ۱۹۸۷ء کو صبح کے ۹ بجے سے سمینار کا سلسلہ شروع ہوا۔ صرف فارسی زبان میں مقالے پڑھے گئے۔ مقالہ نگار حضرات اور موضوعات کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

صدارت: پروفیسر سید امیر حسن عابدی

۹ بجے صبح		تلاوتِ کلامِ پاک
۹/۱۵ ″	ڈاکٹر خاتمی وزیر ارشاد اسلامی	افتتاحی تقریر
۹/۳۰ ″	ڈاکٹر جاوید اقبال	اتحادِ عالمِ اسلامی و جہانِ سوم
۱۰/۰۰ ″	جناب غلام رضا سعیدی (ایران)	ماہیئت و اہمیت فلسفۂ اقبال
۱۰/۳۰ ″	وقفہ چائے	

صدارت: پروفیسر عبدالشکور احسن

۱۰/۵۰ ″	ڈاکٹر سید جعفری شہیدی (ایران)	انگیزۂ ستیزہ جوئی اقبال با غرب
۱۱/۲۰ ″	ڈاکٹر سید محمد اکرم	تاثیرِ مولوی در ہنر و اندیشۂ اقبال

وقفہ طعام

صدارت: پروفیسر کلیم سہسرامی

۳ بجے سہ پہر	استاد محمد محیط طباطبائی (ایران)	اقبال و زبان فارسی
۳/۳۰ ″	پروفیسر عبدالشکور احسن	اقبال و وحدت جہان اسلام
۳/۵۰ ″	استاد محمد تقی جعفری (ایران)	"من" از دیدگاہ عرفانی اقبال
۵/۲۰ ″	ڈاکٹر وحید اختر (ہند)	عناصر اگزستنیالزم در فکر اقبال

۱۲ مارچ ۱۹۸۷ء

صدارت: ڈاکٹر نور الحسن انصاری

۹ بجے صبح		تلاوتِ کلامِ پاک
۹/۱۵ ″	ڈاکٹر علی اکبر ولایتی (وزیر امور خارجہ)	افتتاحی تقریر

۹/۳۰ صبح	پروفیسر محمد منوّر	حیاتِ سیاسی و اجتماعی غرب از نظر اقبال
۱۰/۰۰ "	خانم ڈاکٹر شہین دخت مقدم	علامہ اقبال و حافظ
۱۰/۳۰ "	چائے کا وقفہ	

(نوٹ: بجلی نہ رہنے کے باعث بعد کا اجلاس نہ ہو سکا دوپہر کے کھانے تک اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔)

صدارت: پروفیسر محمد منوّر

۳ بجے سہ پہر	ڈاکٹر اسماعیل حاکمی (ایران)	شیوۂ غزل سرائی اقبال
۳/۲۰ "	ڈاکٹر امیر حسن عابدی	تضمیناتِ اقبال
۳/۴۰ "	ڈاکٹر محمد ریاض	غرب ستیزی علامہ اقبال
۴/۰۰ "	ڈاکٹر شیخ الاسلامی (ایران)	عرفان و اقبال
۴/۲۰ "	ڈاکٹر نور الحسن انصاری	اقبال و جہاں بینیٔ او

چائے کا وقفہ

صدارت: ڈاکٹر جاوید اقبال

۴/۴۵ سہ پہر	ڈاکٹر علی حسون (شام)	زمینہ ہای عرفانی در تفکر اقبال
۵/۰۰ "	ڈاکٹر جلیل تجلیل (ایران)	تعہد در شعر اقبال
۵/۲۰ "	سیّد عطاء اللہ مہاجرانی (ایران)	احیای فکر دینی از دیدگاہ اقبال

۱۳ مارچ ۱۹۸۶ء

صدارت: ڈاکٹر محمد ریاض

۹ بجے صبح		تلاوتِ کلامِ پاک
۹/۱۵ "	ڈاکٹر محمد فرہادی (وزیر کلچر و اعلیٰ تعلیم)	افتتاحی تقریر
۹/۳۰ "	ڈاکٹر عز الدین عثمانی (سفارت ہند)	انسان و زندگی در شعر اقبال
۱۰/۰۰ "	ڈاکٹر اختر امام (سری لنکا)	اہمیت پیام و آثار اقبال

چائے کا وقفہ

صدارت: ڈاکٹر اختر امام

۱۱/۲۰ صبح	ڈاکٹر محمد علوی مقدم (ایران)	اقبال و قرآن
۱۱/۵۰ "	جناب محمد مجتہد شبستری (ایران)	اجتہاد از نظر اقبال

دوپہر کے کھانے کا وقفہ

صدارت : ڈاکٹر جاوید اقبال

۳ بجے سہ پہر	ڈاکٹر غلام رضا اعوانی (ایران)	اقبال و مغرب زمین
۳/۳۰ "	ڈاکٹر محمد کلیم سہسرامی	فلسفۂ احیای ملت اسلامی از نظر اقبال
۴/۰۰ "	جناب روشن گر (ایران)	غزل اقبال با لحن ایرانی

چائے کا وقفہ

۴/۳۰ سہ پہر	ڈاکٹر ابو الفضل نبئ (ایران)	اقبال لاہوری منادی وحدت اسلامی
۴/۵۰ "	جناب سید محمود علی	ویژگیہای اقبال
۵/۲۰ "	جناب کوچکیاں (ایران)	اقبال، فکر دینی و انقلاب اسلامی

سیمینار کے اختتام پر تمام مقالہ نگاروں کو "اقبال اکیڈمی" کی مطبوعات پیش کی گئیں۔ تہران یونیورسٹی کے ڈین آف لیٹرز ڈاکٹر جلال الدین مجتبوی نے شروع سے آخر تک بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سیمینار کی کارروائی انجام دی۔ انھوں نے سیمینار کے اختتام پر اعلان کیا کہ ڈیڑھ گھنٹے بعد "ہوٹل لالہ" میں شب شعر (مشاعرہ) کا انعقاد ہوگا۔ شعرا اور سامعین سے شرکت کی گزارش ہے۔ چنانچہ رات کے ساڑھے سات بجے علامہ بروجردی (داماد امام خمینی) کی صدارت میں شعر خوانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایرانی شعرا کے علاوہ پاکستان سے پروفیسر سید محمد اکرم اور بنگلہ دیش سے پروفیسر کلیم سہسرامی نے فارسی زبان میں نظمیں پیش کیں۔ اس کے بعد حاضرین کی تواضع پُر تکلف ناشتے اور چائے سے کی گئی (تمام کارروائی ٹیلی ویژن پر پیش کی گئی)۔

دوسرے دن تمام غیر ملکی مندوبین کو طیارے کے ذریعے مشہد لے جایا گیا جہاں انھوں نے آستان قدس رضوی، اس سے منسلک لائبریری اور عجائب گھر کی زیارت کی۔ اس کے بعد تقریباً ۲۵ میل دور شہر طوس میں داخل ہونے سے پہلے حضرت امام غزالیؒ کی خانقاہ اور درس گاہ کی زیارت کی۔ پھر شہر طوس (جو اب دیہات رہ گیا ہے) میں ایران کے شہرہ آفاق شاعر فردوسی کا مقبرہ، اس کے احاطے میں عجائب گھر کی مختلف چیزوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا گیا، شام کے جھٹپٹے میں برف پڑ رہی تھی۔ انتہائی ٹھنڈی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ اسی احاطے کے رستوران میں مہمانوں کی تواضع کیک اور چائے سے کی گئی۔ اس کے بعد یہ قافلہ مشہد کے "ہوٹل جم" میں واپس آگیا۔

دسویں صدی ہجری کی ادبی روایات کا سراغ

دیوان حسن شوقی

مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی

گلہائے رنگ رنگ

براہِ راست عربی سے ترجمہ

گونگی توپ

ماہر احمد حسونہ / قطب اللہ

شریف پیدائشی گونگا اور بہرہ تھا۔ شاید اسی لیے سارا گاؤں اس پر رحم بھری نظر ڈالا کرتا تھا۔ لیکن اس کے باپ کے دل میں جیسے کانٹا کھٹک رہا تھا۔ وہ جب بھی سامنے آتا یہ چبھن تیز ہو جاتی اور معمولی سی غلطی پر اسے بڑی بے دردی سے پیٹنے لگتا۔ مار کھانے کے بعد وہ جی بھر کر روتا۔ بے زبان فریاد بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ گھر میں ماں موجود ہوتی تو اسے سینے سے لگا کر اس کے آنسوؤں کو بٹالیتی۔

شریف کے باپ کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ کمبخت اتنا بڑا ہو گیا مگر ناکارہ ہے۔ لڑکیوں کی طرح گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔ یا پھر آوارہ گردی پر نکلتا ہے تو چھ چھ گھنٹے غائب رہتا ہے۔ میرا تو محلے میں شرم سے سر جھک جاتا ہے جب لوگ مجھے شریف کے والد کہہ کر پکارتے ہیں۔

دستور کے مطابق محلہ میں لوگ صبح شام اکٹھا ہوتے، موجودہ حالات پر بات چیت ہوتی، تو اس کا پڑوسی ابو محمود جس کے دو لڑکے فدائین کی تنظیم میں داخل ہو گئے تھے اور بڑے بہادر و جنگجو مشہور تھے۔ ان کا ذکر کر کے اپنی چھاتی کئی گز کی کر لیتا تھا اور اہلِ محلہ خاص کر شریف کے والد کو بڑے طنز سے دیکھا کرتا۔ وہ فخر سے کہتا "میاں میرے بیٹے شیر ہیں شیر"، جب وہ بچے تھے تبھی سے ان کے لچھن صاف ظاہر ہو گئے تھے کہ یہ دونوں کوئی نہ کوئی معرکہ خیز کام انجام دیں گے۔ جب بھی اسرائیلی پولیس کی ٹولی گزرتی دونوں اس پر پتھر برسایا کرتے تھے۔ ایک بار بڑے والے نے جانتے ہو کیا کیا؟ ایک اسرائیلی پولیس کو تنہا پا کر لاٹھیوں سے پیٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسا اور بہت دیر تک ہنستا رہا۔

لوگ جب مجلس سے اٹھ کر چلے گئے تو شریف کا باپ بھی خاموشی سے اُٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دروازے پر پہنچا تو دیکھا شریف محلے کی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا ہے۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔ ابو محمود کا وہ فخریہ قہقہہ اب بھی اس کا منہ چڑھا رہا تھا "میرے دونوں بیٹے شیر ہیں شیر . . . . ." اور اس نے یہ گونگا پیدا کیا ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ شریف کو لگا پیٹنے۔ کئی لات مارے۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ وہ زور زور سے رونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور رحم بھری نظروں سے اپنے باپ کو دیکھنے لگا۔ شکایت کرنے کا حق تو قدرت ہی نے چھین لیا تھا۔ ہاں اس کی آنکھیں ضرور یہ کہہ رہی تھیں۔ ابو . . . . میرا کیا قصور ہے۔ آپ مجھے اس طرح کیوں پیٹتے ہیں؟

شریف زمین پر پڑا اب بھی رو رہا تھا۔ اس کا باپ گھر کے اندر چلا گیا۔ دہلیز کے اندر قدم رکھتے ہی وہ زور زور سے شریف کو کوسنے لگا۔ لعنت ہے اس پر کمبخت نہ جانے کس گھڑی پیدا ہوا تھا۔ سامنے شریف کی ادھیڑ عمر کی ماں کھڑی تھی۔ جس کے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر نرمی سے کہا "کیوں خفا ہوتے ہو آخر اتنا کیوں نہیں سوچتے کہ وہ گونگا باؤلا ہے۔ اتنی عقل ہی کہاں کہ بھلے برے کی تمیز کر سکے۔ اور ابھی آخر بچہ بھی تو ہے"

سورج غروب ہو چکا تھا۔ محلہ کی مسجد میں مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ شریف کی ماں نے جلدی سے جائے نماز بچھائی میاں بیوی اور دونوں لڑکیوں نے نماز ادا کرنے کے لیے صف باندھ لیے۔ نماز کے بعد چاروں بڑی دیر تک سارے جہاں کے رب سے دعائیں کرتے رہے۔ ان دعاؤں کا لب ولباب تھا۔ اے خداوند قدوس قبلۂ اول سے ناپاک قدموں کے وجود کو ختم کر۔ مجاہدین کو کامیابی عطا کر اور ارضِ فلسطین پر آزادی کا سورج طلوع کر۔

نماز کے بعد دستر خوان بچھایا گیا۔ گھر کے تمام افراد سوائے شریف گونگے کے کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ بیچ بیچ میں شریف کی کمی محسوس کی گئی۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ مگر پھر بھی کسی نے توجہ نہیں کی۔ کیونکہ اکثر وہ رات گئے تک واپس آتا تھا۔ بات چیت کا سلسلہ طویل ہو تا گیا۔ یہاں تک کہ شریف کی ماں جمائیاں لینے لگی۔ اسے نیند آنے لگی تھی۔ لوگوں نے جلدی سے عشا کی نماز ادا کی اور سونے چلے گئے۔

نہ جانے کیوں آج شریف کے والد سے نیند روٹھ گئی تھی۔ اس نے سونے کی بڑی کوشش کی مگر نیند نہیں آئی۔ وہ لیٹے لیٹے خیالوں میں کھو گیا۔ کبھی وہ اسرائیلی ظلم وجبر پر سوچتا تو کبھی عربوں کے آپس کے اختلاف پر افسوس کرتا۔ مقبوضہ علاقہ اور اپنے گاؤں کے بدحال لوگوں پر غور کرتا تو اس کے سامنے اس کا گونگا بیٹا شریف آجاتا جو کسی کام کا نہیں تھا۔ وہ انہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک وہ چونک اٹھا۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کہیں قریب سے گولے پھٹنے کی آواز آرہی تھی۔ اور یہ آواز برابر تیز ہوتی گئی۔ وہ زیر لب مسکرایا "اللہ تم لوگوں کی مدد کرے میرے بچو"

دھماکوں سے شریف کا باپ ہی نہیں بلکہ پورے گاؤں کے پرسکون ماحول کا گلا گھٹ گیا تھا۔ سب لوگ اپنے بستروں میں پڑے پڑے سوچ رہے تھے کہ آج فدائین کا کوئی دستہ سرحد پار کر کے داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ آج ان امریکی یہودیوں کی خیر نہیں جنھوں نے سال بھر پہلے امریکہ سے یہاں آکر قبضہ جمالیا تھا اور عربوں کو بھگا کر ان کے باغات اور کھیتوں پر غاصبانہ قبضہ کر کے ڈالر کے سہارے فلک بوس عمارتیں کھڑی کر لی ہیں۔

مشین گن کی بھی آواز آرہی ہے۔ شاید اسرائیلی فوجی بھی قریب کی چوکی سے آگئے ہیں۔ سارا گاؤں انجانے خوف اور آنے والے لمحے کے بار کے نیچے دبا جا رہا تھا۔ فائرنگ کی آواز اب ذرا مدھم پڑ گئی تھی۔ رک رک کر اکا دکا آواز آرہی تھی۔ سارا گاؤں جاگ رہا تھا۔ گھروں کے دروازے بند تھے، گلیاں سنسان تھیں۔ رات کے گھپ اندھیرے میں وادی کنمنا اٹھی۔ مشین گن کی آواز اب بھی کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔

ایک بار سناٹے اور خاموشی کا پھر راج ہو گیا۔ شریف کا باپ بستر پر پڑے پڑے اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا اسی درمیان اسے محسوس ہوا کہ دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔ دستک صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے کئی بار غور

سے سنا۔ وہ اللہ کا نام لے کر چارپائی سے اٹھا اور دروازے کے پاس پہنچ کر پوچھا دد کون ۔۔۔؟ ۔۔۔۔۔ کون ہے؟ دستک دینے والے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ برابر کنڈی کھٹکھٹائے جا رہا تھا۔ گھر والے تردد میں پڑ گئے۔ کیا کریں؟ شریف کے والد نے ہمت کر کے دروازہ کھول دیا۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک بار اس کا دل پھر بہت سے خطرات کا احساس کر کے تیز تیز دھڑکا۔ اس نے دروازے سے باہر سر نکال کر دائیں بائیں غور سے دیکھنا شروع کیا۔ بغل میں دیوار کا سہارا لیے کوئی گہری گہری سانس لے رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پہچاننے کی کوشش کی۔ دیوار سے چپکے سائے کے جسم سے شاید خون بہہ رہا تھا۔ کیوں کہ اس کا لباس سرخ ہوا جا رہا تھا۔ اچانک اندھیرے میں ایک آواز ابھری۔ میرا بیٹا ۔۔۔۔۔ شریف، میرے جگر کا ٹکڑا، تو کہاں تھا؟ تجھے کیا ہوا؟ اس نے شریف کو سینے سے لگا لیا۔ شریف زخموں سے چور چور، قوتِ گویائی سے محروم، کیا جواب دیتا۔ سب نے یہی اندازہ لگایا کہ شاید یا قلے کو کسی نے کنوئیں میں دھکیل دیا ہو یا خود ہی اندھیرے میں گر گیا ہو گا۔ نہ جانے کہاں بھٹک رہا تھا۔ کتنی بار سمجھایا کہ یہ آوارہ گردی چھوڑ دے مگر نہیں مانتا۔ پھر اپنے کیے پر افسوس بھی ہوا کہ ناحق شام کو پٹائی کی تھی۔ نہیں ۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔۔ اسے تو گولی لگی ہے۔ ان اسرائیلی کتوں نے اکیلا مشتبہ حالت میں پا کر اسے زخمی کیا ہے۔

شریف کے جسم سے کافی خون نکل گیا تھا۔ وہ کھڑا نہ رہ سکا اسی جگہ زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر لیٹ گیا۔ اس نے ایک طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے زبان کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی بہن پانی لینے دوڑی۔ وہ زور سے چیخا مگر اس کی بھاشا ہر کوئی سمجھنے سے قاصر تھا۔ جدھر سے دھماکوں کی آواز آ رہی تھی اس طرف ہاتھ اٹھایا اور پھر اس کا ہاتھ زمین پر ایسا گرا کہ دوبارہ نہ اٹھ سکا۔ ماں دہلیز سے باہر آ کر اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ بہنوں نے آنسوؤں سے دوپٹے بھگو لیے۔ لاش کو سب اٹھا کر گھر کے اندر لے گئے۔ شریف کے باپ نے تھکے تھکے قدموں کے ساتھ بوڑھے ہاتھوں سے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

شریف کی تدفین کے بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ بعد مغرب جب اندھیرا گہرا ہو گیا۔ گاؤں چراغوں کی ضعیف روشنی میں پھیکی ہنسی بکھیرنے لگا۔ ایسے میں شریف کے گھر میں سناٹا اور اندھیرا ہی غالب تھا۔ اس کی چھوٹی بہن نے گھبرا کر ریڈیو آن کر دیا ریڈیو پر زور زور سے قومی نغمے بج رہے تھے۔ بڑی جوشیلی آواز میں کوئی فلسطینی فدائی گا رہا تھا۔ شریف کا باپ بھی کھسک کر ریڈیو کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ بیٹے کی موت کے بعد وہ لٹا لٹا سا لگ رہا تھا۔ گزشتہ رات کے دھماکوں پر اب تک کوئی روشنی نہیں پڑی تھی۔ رات کا واقعہ ایک معمہ بنا ہوا تھا۔ اسرائیلی ریڈیو نے تو سرے سے اس کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا اور نہ تو کسی عرب ریڈیو نے اس پر سے پردہ اٹھایا تھا۔ ہر کوئی اس واقعہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس علاقہ میں اب بھی مسلح فوج کا پہرہ تھا۔ دن میں ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں بھی آ جا رہی تھیں۔

جب قومی نغموں کا پروگرام ختم ہوا تو اناؤنسر کی آواز ابھری:

"حضرات ریڈیو ندائے فلسطین آپ سے مخاطب ہے۔ آج کی خبروں میں سب سے اہم خبر پیش ہے۔
گزشتہ رات ہماری خفیہ تنظیم کے ایک ممبر نے امریکہ سے آ کر بسے ہوئے ان مالدار یہودیوں کی ٹھوس فلک بوس عمارتوں کو ڈائنا مائٹ سے اڑا دیا جنھوں نے ہمارے عرب بھائیوں کو ان کی سرزمین سے نکال کر ان کے نارنگی کے باغات اور کھیتوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ یہ واقعہ مقبوضہ سرزمین

کے موضع تلقیلیہ میں پیش آیا۔ اس مجاہد نے نہ صرف ان عمارتوں اور ان کے مکینوں کو خاک میں ملا دیا بلکہ قریب کی اسرائیلی چوکی کے سارے محافظوں کو بھی موت کے گھاٹ اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ عظیم کارنامہ ہماری خفیہ فدائی تنظیم کے ایک سرگرم رکن محمد شریف نے انجام دیا۔ آپ لوگوں کو یہ سن کر افسوس بھی ہوگا کہ ہمارا یہ ہیرو اب اس دنیا میں زندہ نہیں ہے۔ وہ جام شہادت نوش کر چکا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بہادر شریف پیدائشی گونگا اور بہرہ تھا لیکن اسے مادرِ وطن کی آزادی کا پورا پورا احساس تھا۔ ہم تنظیم الفتح کی جانب سے ان کے والدین اور گاؤں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ خوش ہوں گے کہ ان کا خون رائیگاں نہیں گیا۔"

سارا گاؤں ہی نہیں خود شریف کے والد، اس کی ماں اور بہنوں کو اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ یا اللہ ہم یہ کیا سن رہے ہیں؟ ان کی رگوں میں خون جوش مارنے لگا۔

گاؤں کی گلی گلی میں یہ چرچا ہونے لگا۔ لوگ حیرت سے ذکر کرتے۔ ارے ...... !! اتنا بڑا کارنامہ اس گونگے نے انجام دیا؟" شریف کا غم زدہ باپ خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔" ارے او شریف کی ماں ... تم نے سنا، ہمارا بیٹا مرا نہیں ہے اسے شہادت نصیب ہوئی ہے، شہادت۔ وہ فدائی تھا شریف کی ماں!! اب میں گاؤں میں سینہ تان کر چلوں گا ... میں جا کر ابو محمود کو ابھی بتاتا ہوں کہ تم نے شیر پیدا کئے ہیں تو میں نے بھی شیر ببر پیدا کیا تھا۔ یہ بتانا بہت ضروری ہے ... شریف کی ماں!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازہ کھول کر ایک طرف چیختا ہوا دوڑنے لگا۔

گاؤں والو کان کھول کر سن لو ...... میرا بیٹا گونگا نہیں تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ گفتگو کس طرح کی جاتی ہے۔ اس کے آداب سے وہ اچھی طرح واقف تھا لیکن تمہاری زبان میں نہیں بلکہ ایک حسین ترین لب و لہجہ میں، انقلاب کی آواز، گولے، بارود، بم اور ڈائنامائٹ کی زبان میں۔

مفکرینِ اسلام

مصنفہ

مولانا عبید اللہ قدسی

صفحات: ۱۶۳ — قیمت: ۲۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی نمبر ۱

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

ترجمہ: آفاق صدیقی

کافی

جلدی سے بیت نہ جائے
اے رات اگر تو رک جائے

میں پھولے نہیں سماؤں ، پریتم کو خوب رجھاؤں ۔ اے رات اگر تو رُک جائے
میں آپ ہی دیپک بن کر ۔ یہ جیون جوت جگاؤں ۔ اے رات اگر تو رُک جائے
سجنوں کے دھیان کی دھونی ۔ تن من میں آج رماؤں ۔ اے رات اگر تو رُک جائے
وہ بھید کوئی کیا جانے ۔ جو پریت لگن میں پاؤں ۔ اے رات اگر تو رُک جائے
دلبر کا درد دوامی ۔ رگ رگ میں اسے رچاؤں ۔ اے رات اگر تو رُک جائے
سجنا کی داسی بن کر ۔ میں سکھ داسی کہلاؤں ۔ اے رات اگر تو رُک جائے
من میت ہوں میں سیّد کی ۔ پھر کھوئی کیوں رہ جاؤں ۔ اے رات اگر تو رُک جائے
مرا حامی شافعِ محشر ۔ میں حشر میں کیا گھبراؤں ۔ اے رات اگر تو رُک جائے
ہوں پریت لگن کی پیاسی ۔ میں پیاس سے پیاس بجھاؤں ۔ اے رات اگر تو رُک جائے

ہے عشق لطیفؔ مدامی
تن من میں اسے بساؤں
اے رات اگر تو رُک جائے

("شاہ جو رسالو" کے سُر کھمبات کی پہلی داستان سے)

مصنف خوشحال خان خٹک

مترجم: نثار غزنی

اکیلا

میں دیکھتا ہوں مغل وہ پہلے مغل نہیں ہیں
بجائے تلوار کے دھنی، ہیں وہ اب قلم کے
وہ آج افغان کو مکر و حیلے سے اور دولت سے پھانستے ہیں
یہاں فقط ایک میں ہوں جس پر
نہ چل سکا اُن کا کوئی جادو
یہ زاغ کی اور مکھیوں کی خصوصیت ہے
کہ گندگی پر گزر ہے ان کا
مگر میں شاہیں ہوں اوج پر ہیں مری نگاہیں
شکار اپنے سے شاد ہوں میں
الم ہے اتنا مجھے کہ کوئی یہاں مرا ہمنوا نہیں ہے
وہ خانِ ایمل، وہ خانِ دریا جو سو گئے نیند آبرو کی
یہی مجاہد مری امیدوں کی زندگی تھے
وہ دیکھو مغلوں نے روبرو ان افاغنہ کے
رکھا ہے حلوے کا تھال گویا
حقیر مکھی کی طرح یہ جس پہ روز و شب بھنبھنا رہے ہیں
سہارے سب ہو گئے شکستہ
مجھے تو اب آسرا ہے اک ذاتِ کبریا کا
چلے گئے ایمل اور دریا
جو باحمیت تھے ہوش مندی میں منفرد تھے
بس اب تو مغلوں سے سرکشی کو
اکیلا خوشحال رہ گیا ہے۔

گلہائے رنگ رنگ

پشتو ادب میں ڈرامہ

تصنیف: پروفیسر محمد اعظم اعظم

ترجمہ: احمد پراچہ

پشتو نثر کے موجودہ دور میں ڈرامے کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ باقاعدہ شکل میں پشتو ڈرامے کی روایت پانچویں صدی تک پہنچتی ہے، جس کی ابتدا عبدالاکبر خاں اکبر کے ڈرامے "تین یتیم" سے ہوتی ہے۔ یہ ڈرامہ ۱۹۲۷ء میں اسٹیج کیا گیا تھا۔

اس ڈرامے کا طرز اور رنگ اصلاحی تھا اور عوام میں کافی مقبول ہوا۔ اور اس طرح پشتو کے ادیبوں کی توجہ ادب کی اس جدید صنف کی طرف مبذول ہوئی اور پشتو میں ڈرامے لکھنے کا رواج شروع ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں "درد" کے نام سے ایک ڈرامہ اسٹیج کیا گیا۔ جو موضوع، پلاٹ، واقعات اور مکالمات کے لحاظ سے ایک پر اثر ڈرامہ تھا اور یہ پشتو کے آئندہ دور کے ڈرامہ لکھنے والوں کے لیے ایک اہم کڑی ثابت ہوئی۔

عبدالخالق خلیق، فضل رحیم ساقی اور عبدالاکبر خاں اکبر کے ڈرامے بھی پسند کیے گئے۔ اور انھیں ڈراموں کی روشنی میں پشتو کے بعض لکھنے والوں نے کچھ اصلاحی رنگ میں ایسے ڈرامے لکھ ڈالے کہ انھیں ہم پشتو کے موجودہ ڈرامے میں موتیوں کی مالائیں کہہ سکتے ہیں۔ اصلاحی رنگ کے ان ڈراموں میں عبدالخالق خلیق کا ڈرامہ "سکینہ شہید"، قاضی رحیم اللہ کا ڈرامہ "نئی روشنی" اور عبداللہ جان اسیر کا ڈرامہ "درسِ عبرت"، کتابی شکل میں چھپ چکا ہے جو اپنے مخصوص اصلاحی رنگ اور حقیقی بیٹھانوں کے خوب صورت ماحول کی عکاسی کی وجہ سے عوام میں بہت مقبول ہوئے۔

اِن تینوں ڈراموں میں پشتونوں کی غلط رسموں، رواجوں اور پشتون معاشرے کے بعض ناپسندیدہ پہلوؤں پر تنقید بھی کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ نئی زندگی، جدید تعلیم اور تازہ شعور کی روشنی میں سنورنے کی دعوت بھی دی گئی ہے۔

اصلاحی ڈرامے کی روایت کے سلسلے میں سب سے زیادہ بہترین اور اہم اضافہ "خون کا پیالہ" ڈرامہ ہے۔ اگر "خون کا پیالہ" کو پشتو ڈرامے کے اس پہلے دور میں ایک محور اور مرکزی نقطہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ "خون کا پیالہ"، فنّی لحاظ سے اپنے دور میں سب ڈراموں سے سبقت لے گیا اور اس ڈرامے میں پہلی مرتبہ شعوری انداز سے اس دور کے اردو اسٹیج ڈرامے کے تمام لوازمات کا خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً ترتیب، تکنیک، پلاٹ، پردوں اور منظروں کا التزام اس میں خصوصی انداز سے رکھا گیا ہے۔ ہر چند کہ اب اس ڈرامے کی کردار نگاری میں "مثالیت" کی ضرورت

باقی نہیں رہی لیکن پھر بھی اس کے واقعات، ماحول اور کردار اپنے دور، اپنے معاشرے کے باسیوں کی عکاسی کرتے ہیں اور کردار و واقعات کے زور پر ایک ایسے موثر المیے کو جوڑتے ہیں کہ اس کا اثر ایک طرف مقصدی پہلو اُجاگر کرتا ہے تو دوسری طرف فنّی پہلو بھی رکھتا ہے۔

پشتو کا ریڈیائی ڈرامہ

تقسیم ملک سے قبل ۱۹۳۶ء میں ریڈیو پشاور کی بنیاد رکھی گئی تو عوام کی اصلاح اور تفریح کے پیشِ نظر پشتو زبان میں بھی ڈرامے کی یہ نئی طرز شروع ہوگئی جسے ریڈیو یا ریڈیائی ڈرامہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ریڈیو ڈرامہ نے ڈرامے کے فن اور تکنیک کو ایک نئی روح بخشی۔ یہاں اسٹیج اور عمل (ایکٹنگ) کی جگہ سب کچھ آواز کے حوالے ہوگیا اور آواز کی لہروں میں تصوّر کی دنیا آباد کرنا قلم کے جادوگروں کا کام ثابت ہوا، اور یہ کرداروں کے اعمال و حرکات میں لفظوں کی صورت میں ظاہر ہونے لگا تو سارا زور مکالمے پہ آگیا اور مکالمے کے وسیلے سے سننے والوں نے اپنی گرفت اور اپنی سوچ کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ نئے ڈرامہ نگاروں کے فن کی ضرورت بھی ثابت ہوئی اور کمال بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ پشتو کے ڈرامہ نویسوں کو ریڈیو کے وسیلے سے پہلی مرتبہ ایسے ذہین اور چابک دست ڈرامہ نگار ملے جو کہ انگلیوں پہ گنے جاسکتے تھے لیکن جنھوں نے اس راستہ پہ ابتدا میں خاصی کامیابیاں حاصل کیں اور یہ بات کہنے میں کچھ مبالغہ نہ ہوگا کہ "ریڈیائی ڈرامے" نے پشتو ادب میں ڈرامے کی صنف کو ایک مستقل مقام دیا۔ جب کہ ریڈیو سے پہلے ہمارے ڈرامے کا رنگ کافی حد تک سیاسی اور نظریاتی تھا اور اصلاحی رنگ بھی ان ڈراموں میں غالب تھا۔ اگرچہ خالص مقصدیت کا رویہ جوش اور جذبہ کچھ اوپر اُٹھا اور اصلاح کے پردے میں ہر طرف تبلیغ اور پروپیگنڈا ہوتا۔ لیکن ریڈیائی ڈرامہ کے آتے ہی اصلاحی پہلو کے ساتھ فنّی محاسن بھی شامل ہوگئے اور دوسری زبانوں کے مطالعے کی روشنی میں اپنے معاشرے کے موضوعات پہ ایسے ڈرامے لکھے گئے کہ ان میں خیالات کی بلندی کے ساتھ ساتھ فنی خوبیاں بھی پائی جانے لگیں۔

ریڈیائی ڈرامے کے ابتدائی دور میں عبدالکریم مظلوم، امیر حمزہ شنواری اور داؤد شاہ برق نے بہت خوب صورت تفریحی اور مقصدی ڈرامے لکھے۔ عبدالکریم مظلوم کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ "چہرے" کے عنوان سے کتابی شکل میں چھپ بھی چکا ہے۔

۱۹۴۵ء کے بعد ان لکھنے والوں کے ساتھ سمندر خاں سمندر اور شوکت اللہ خاں اکبر کے نام بھی شامل ہوگئے۔ انھوں نے ڈرامے کو ترقی دینے میں کافی حد تک حصّہ لیا اور انھیں کے ساتھ آزادی کے بعد جن لکھنے والوں نے ریڈیائی ڈرامے کے ضمن میں شہرت پائی اُن میں کچھ نام ور لکھنے والے یہ ہیں۔

سیّد رسول رسا، میجر ایس۔ اے رحمٰن، ایاز داؤد زئی، اشرف مفتون، محمد یوسف خان اورزئی، رشید علی دہقان، عبداللہ جان مغموم، رضا مہمندی، عمر ناصر، ولی محمد خلیل، نثار مظلوم، افضل رضا، محمد ہمایون ہما، نثار محمد خان، یونس قیاسی، سردار خان فنا اور محمد اعظم اعظم۔ اِن لکھنے والوں نے اصلاحی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ رومانی، عشقیہ اور مزاحیہ موضوعات پر بھی موثر اور فنی میزان پہ پورے اترنے والے ڈرامے لکھے۔

اسٹیج ڈرامہ

یہ بات بہت ہی عجیب نظر آتی ہے کہ پشتو ڈرامے کی ابتدا فطری رنگ لیعنی اسٹیج سے ہوئی تھی لیکن اس کا ارتقا قطعی غیر فطری طرز میں ہوا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پشتو ڈرامے نے حقیقی معنوں میں اسٹیج یا تھیٹر کی شکل نہیں دیکھی۔ نہ سرکاری سطح پر اور نہ ہی عوامی سطح پر۔ پشتو ڈرامے کے لیے اسٹیج نہ ہونے کے سلسلے میں جو عوامل اور پابندیاں آئی ہیں اس کے لیے الگ ایک مقالہ کی ضرورت ہے۔ لیکن باقاعدہ اسٹیج سے کچھ قبل شوقیہ انداز میں گزشتہ بیس، بائیس سالوں میں پشتونوں کے مختلف علاقوں کے اسکولوں اور کالجوں میں عموماً اور پشاور اور اسلامیہ کالج میں خصوصاً باقاعدہ ڈرامے اسٹیج ہوئے۔

۱۹۵۸ء اور ۱۹۷۸ء کے بیس سالہ درمیانی عرصہ میں راقم الحروف (محمد اعظم اعظم) نے خیبر یونین ہال میں باقاعدہ ڈرامے لکھے اور اسٹیج بھی کیے۔

اس مختصر عرصہ میں ٹیلی ویژن کے توسط سے پشتو کا ڈرامہ وقت کے ساتھ ساتھ بہت کامیاب رہا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ٹیلی ویژن نے اس رفتار اور تیزی کے ساتھ لکھنے والے پیدا نہیں کیے جس رفتار اور تعداد کے اعتبار سے ریڈیو نے اپنے ابتدائی دور میں پیدا کیے تھے۔ لیکن پھر بھی اس راستے پر ابھی تک گنتی کے جن چند لوگوں نے سفر کیا ہے وہ کامیابی کا سفر ہے۔

جگر مُراد آبادی

آثار و افکار

مصنف —— ڈاکٹر احمر رفاعی

صفحات —— ۲۹۲

قیمت : ۲۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی

گوشۂ طلبہ

تاریخ

ہیروڈوٹس: تاریخ کا بانی

ڈاکٹر مبارک علی

"انسانی تمدن کی تاریخ میں جنگ وہ ذریعہ رہی ہے جو معاشرے میں تیزی سے سماجی تبدیلیاں لاتی ہے یہ تبدیلی اور تغیر اس قدر انقلابی ہوتا ہے کہ ایک انسان اپنی زندگی میں اس عمل کا یہ غور مطالعہ کر سکتا ہے۔ اسی لیے مورخ جنگ کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔"

(ٹائن بی)

ہیروڈوٹس نے اپنی زندگی میں مشرق اور مغرب کی دو عظیم قوتوں کو برسرپیکار دیکھا اور اس کا بھی مشاہدہ کیا کہ اس تصادم اور کشمکش نے اس کے عہد اور زمانے میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ معاشرہ سماجی و معاشی اور سیاسی تبدیلیوں سے دوچار ہوا روایات و اقدار بدلیں اور لوگوں کے سوچنے اور غور و فکر کے انداز میں تبدیلی آئی۔ اس لیے ہیروڈوٹس نے جب ان جنگوں کو اپنا موضوع بنایا تو اس کے ذہن میں سب سے زیادہ اہم سوال یہ تھا "یہ انقلابی تبدیلی کیوں آئی"، جس نے یونانی سیاست اور معاشرے کے تمام ڈھانچے کو بدل کر رکھ دیا۔ اس کے نزدیک یہ جنگ دو طاقتوں کے علاوہ دو تمدنوں کی بھی جنگ تھی۔ اور اس تصادم کی وجہ سے مشرق اور مغرب دونوں بری طرح متاثر ہوئے۔ ایران اور یونان کے درمیان جو جنگیں ۴۷۹ سے لے کر ۴۸۰ ق۔م تک ہوئیں انھوں نے دونوں قوموں اور ان کی تہذیبوں پر گہرے اثرات ڈالے۔ ہیروڈوٹس نے ان جنگوں کے پس منظر میں جن تاریخی نظریات کا اظہار کیا وہ اس کی تاریخ میں ملتے ہیں۔

ہیروڈوٹس کے نزدیک جنگ میں فتح حاصل کرنا یا شکست کھانا ہی سب کچھ نہیں۔ جنگ کے اثرات فتح و شکست کے دائرے سے وسیع ہیں۔ یونان اگرچہ ان جنگوں میں فتح یاب ہوا، مگر اس کے باوجود اس کے مروجہ قدروں اور سیاسی و معاشی نظاموں میں انقلابی تبدیلیاں آئیں۔ ان جنگوں نے اس کی خاموش سطح پر طوفان برپا کر دیے۔ اور اس کے سماجی و معاشرتی، و معاشی تنظیم میں انقلاب آگیا۔ ایک نتیجہ ان جنگوں کا یہ نکلا کہ ایتھنز ایک طاقت بن کر ابھرا اور اسپارٹا کے مقابلے میں صف آرا ہوگیا۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ یونان کی ریاستوں نے آپس میں ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیا۔ اس طرح یونان جو ایران کے مقابلے میں متحد ہوگیا تھا فتح کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ جگہ جگہ میدان جنگ میں فوجیں صف بستہ ہونا شروع ہوئیں۔ ریاستوں میں رقابتیں ابھریں، جو دشمنی میں تبدیل ہوتی گئیں یونان کی ریاست میں یہ تبدیلی ان جنگوں کے نتیجہ میں ہوئی جسے ہیروڈوٹس کی دوررس نگاہوں نے دیکھا۔ ان نتائج نے فتح و شکست سے بڑھ کر یونانی تہذیب و

تمدن کو متاثر کیا

اس نے تاریخ کیوں لکھی، اور اسے کیوں ضروری سمجھا۔ اس کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ:

"یہ ہیلی کارناسس کے ہیروڈوٹس کی تحقیق کے نتائج ہیں۔ اس میں اس نے انسانوں کے کارناموں کو لکھ دیا ہے، تاکہ یہ تاریخ میں باقی رہیں اور انھیں کوئی بھلا نہ سکے۔ یہ عظیم کارنامے یونانیوں اور غیر مہذب (غیر یونانیوں) لوگوں نے سرانجام دیے ہیں۔ میں نے یہ سب اس لیے لکھ دیا ہے کہ کہیں یہ کارنامے بغیر شہرت کے نہ رہ جائیں۔"

ہیروڈوٹس جب بادشاہوں کے عروج کا ذکر کرتا ہے اور آمروں کی قوت و طاقت کی انتہا کو بیان کرتا ہے تو اس عروج اور کمال کے عمل میں وہ لمحہ دیکھتا ہے جب انھیں کسی ذی ہوش کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ اس طاقت و عظمت کو ابدی و لافانی نہیں سمجھیں اور سوچ سمجھ کے ساتھ قدم اٹھائیں لیکن اس تنبیہ پر کوئی غور نہیں کرتا جس کے نتیجے میں اس کی قوت و طاقت زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے وہ لیڈیا کے بادشاہ کروسس کا تذکرہ کرتا ہے جو بے انتہا دولت مند تھا اور دولت کے نشہ نے اس میں فخر و غرور پیدا کر دیا تھا۔ مشہور مقنن سولن جب ان سے ملنے گیا تو اس نے اسے تقدیر کے نشیب و فراز بتائے جن پر اس نے دھیان نہیں دیا۔ لہذا جب ایرانیوں اور یونانیوں میں جنگ چھڑی تو اس نے ایرانیوں پر حملہ کی تیاری کی۔ اس کے ایک امیر نے اسے جنگ سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ مگر اس نے اس پر غور نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ نے اس کی ساری دولت و شہرت کا خاتمہ کر دیا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ اگر ایرانی بادشاہ بھی اپنے مصاحبین کی نصیحت پر عمل کرتا اور یونان پر حملہ نہیں کرتا، تو وہ بھی اپنی عظمت و شوکت کو بچا سکتا تھا۔

ہیروڈوٹس انسانی تاریخ کے عمل میں مافوق الفطرت طاقتوں کے اثر کا قائل ہے۔ اس لیے دیوتاؤں کی خوشنودی اور ناراضگی کا اثر انسانی معاشرے پر پڑتا ہے۔ خواب، پیشن گوئیاں اور فطرت کی جانب سے دیے گئے اشارے اور نشانیاں تاریخ میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ دیوتا بدی کی سزا ضرور دیتے ہیں۔ اسی لیے تاریخ میں ظالموں کا انجام عبرت ناک ہے۔ اسپارٹا کے بادشاہ ڈیورےٹس (DEVOR ATUS) کو جب اس کے ساتھیوں کلیومینس اور لیوچیڈاس نے تخت سے محروم کر دیا تو آخر میں دونوں کو اس جرم کی سزا بھگتنی پڑی۔

ہیروڈوٹس زیادہ خوش حالی اور دولت مندی کو فرد اور معاشرے کے لیے تباہ کن سمجھتا ہے۔ کیوں کہ اس سے فخر و غرور پیدا ہوتا ہے جو انسان کو گناہ کی جانب لے جاتا ہے اور پھر یہ برے اعمال اسے تباہ کر دیتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ:

"میں نے چھوٹے اور بڑے شہر دیکھے، جو کبھی بڑے شہر تھے اب چھوٹے قصبے ہیں اور جو کبھی میری زندگی میں معمولی قصبے تھے اب بڑے شہر بن چکے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ خوش حالی ایک جگہ نہیں رہتی۔"

وہ تقدیر کا قائل ہے۔ جس طرح تقدیر فرد کو پابند رکھتی ہے اسی طرح قومیں تقدیر کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ تاریخ میں قوموں کا عروج و زوال، اور فتح و شکست سب تقدیر کے کرشمے ہیں۔

ہیروڈوٹس کے نزدیک تاریخ کی تشکیل میں شخصیتیں زیادہ حصّہ لیتی ہیں۔ اس لیے تاریخی عمل زیادہ اہمیت کا حامل نہیں۔ کیوں کہ شخصیتیں اس عمل سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ عمل کو پیدا کرتی ہیں۔

ہیروڈوٹس کے تاریخی مشاہدات اس لیے زیادہ جاندار اور فکر انگیز ہیں، کیوں کہ اس نے جو کچھ لکھا وہ اس کے ذاتی تجربات پر مبنی تھا۔ اس کے پاس تحریری تاریخ کا کوئی ذخیرہ موجود نہیں تھا۔ اس لیے اس نے ان تمام ممالک کا سفر کیا جو ایران کی شہنشاہیت میں شامل تھے ان میں مصر، میسوپوٹامیہ، شام اور بحر روم کے کنارے آباد ریاستیں تھیں۔ اس نے ان تمام ملکوں کی تاریخ، جغرافیہ، اور تہذیب و تمدن کا بہ غور مطالعہ کیا۔ اس لیے اس کی تاریخ کا موضوع اس زمانے کے لحاظ سے دنیا کی تاریخ تھی جس میں اس نے خصوصیت سے غیر یونانی مطلق العنان حکومتیں اور یونانی جمہوریت کو اپنا موضوع بنایا۔ اگرچہ اس کی تاریخ میں اب، سائنس، فلسفہ اور آرٹ کا ذکر نہیں لیکن تہذیبوں کا ذکر ضرور ہے۔ اس نے قوموں کی عادات، اخلاق و عقائد اور رہن سہن کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ روایات کو بڑی اہمیت دیتا ہے کیوں کہ روایات سے عقائد تعمیر ہوتے ہیں۔

اس نے تاریخ لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھا کہ واقعات کو صحیح صحیح بیان کیا جائے۔ "میں اس پر مجبور ہوں کہ اس بات کو بیان کروں جو مجھ تک پہنچی ہے لیکن اس پر مجبور نہیں کہ اس پر یقین بھی کروں۔"

ہیروڈوٹس پہلا مورّخ ہے جس نے تاریخ کو ایک فکری پہلو دیا اور واقعات سے نتائج نکالے۔ اس لیے اسے تاریخ کا بانی کہا جاتا ہے۔

ایک اہم اور نادر کتاب

مقالاتِ برنی

مصنّفہ

سیّد حسن برنی

صفحات ۲۹۵ قیمت مجلد ۶۰ روپے غیر مجلد ۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

پاکستان اسٹیل

محنت کی عظمت — صنعت کی قوت

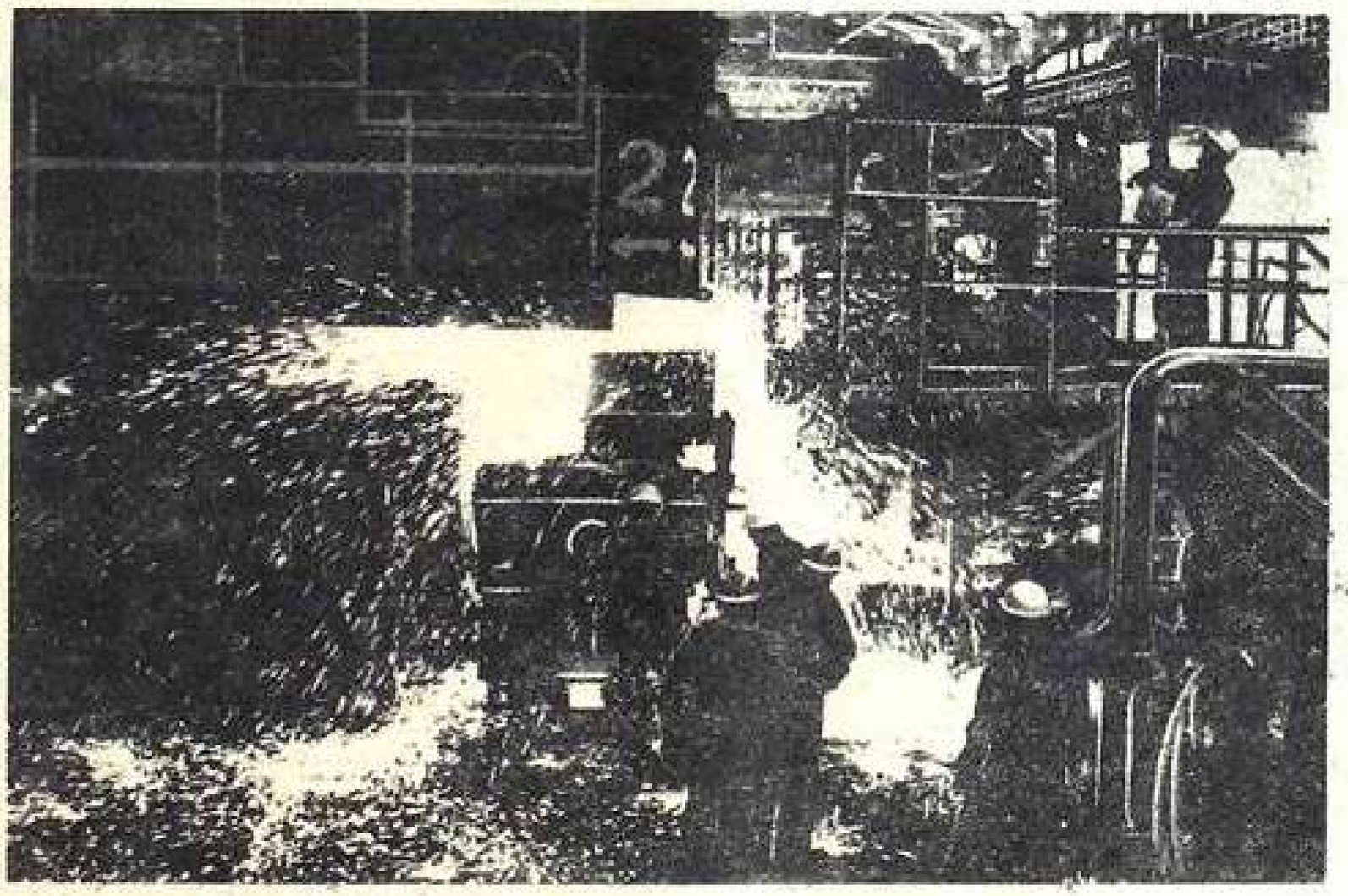

اللہ کے فضل وکرم سے ہمارے انجینئر اور کارکن سو فیصد پیداوار حاصل کرنے کی آزمائش میں کامیاب ہوئے اور اب ملک کی ضرورت کے مطابق مسلسل سو فیصد پیداوار دینے کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔
ہمیں فخر ہے کہ ہم قوم کی توقعات پر پورے اترے اور انشاء اللہ آئندہ بھی ہمارے قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ محنت اور لگن ہماری کامیابی کا راز اور آپ کا اعتماد ہمارا حوصلہ ہے۔

معیاری فولادی مصنوعات کا ضامن

پاکستان اسٹیل
فولاد۔ مضبوط پاکستان کی بنیاد

PID (Islamabad)   manhattan *International*

گوشۂ طلبہ

یہ مشہور مضمون انٹر کے نصاب میں شامل ہے

البرٹ آئن اسٹائن

تلخیص: ممتاز احمد خاں

دنیا میری نظر میں

البرٹ آئن اسٹائن کو اس صدی کا عظیم ترین ماہر ریاضی و طبعیات تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے نظریۂ اضافیت نے سائنسدانوں کے زمان و مکان کے نظریات کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ ایٹم بم کی ایجاد میں آئن اسٹائن کے دیے گئے فارمولے یعنی حرارت کا کمیت (MASS) سے گہرا تعلق ہے، کا بڑا ہاتھ ہے۔

آئن اسٹائن جرمنی میں پیدا ہوا اور اوائل عمری میں ۱۹۴۱ میں اس نے زیورچ سے نقل مکانی کر کے امریکہ میں سکونت اختیار کی اور پھر وہیں کا شہری بن گیا۔ اس کے نظریے کا تعلق لیبارٹری تجربے کے مقابلے میں ریاضی اور دلائل سے ہے۔ اسے ۱۹۱۲ء میں طبعیات کا نوبل پرائز دیا گیا۔ آئن اسٹائن نے عام آدمی کے لیے بہت کم لکھا ہے لیکن جتنا بھی لکھا ہے اسے دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ چند سال قبل اس کے اپنی بھانجی کو لکھے گئے خطوط جب موقر بین الاقوامی رسالے "ریڈرس ڈائجسٹ" میں شائع ہوئے تو تہلکہ مچ گیا۔ اس لیے کہ ان میں ایک سائنسداں کے مشاہدات، تجربات اور خیالات نیز یہ کہ محبت بھرے جذبات بڑے حسین انداز سے لوگوں کے سامنے آئے تھے۔ ان کا مشہورِ زمانہ مضمون "دنیا میری نظر میں" اُن کے ہلکے پھلکے مگر گہرے فلسفیانہ خیالات پر روشنی ڈالتا ہے۔

واضح رہے کہ ان کا انتقال ۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء میں ہوا تھا۔ اسی مناسبت سے اُن کا یہ مضمون اس ماہ شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔

ہمارے لیے اس دنیا میں غیر معمولی صورتِ حال یہ ہے کہ ہم یہاں بڑے مختصر عرصے کے لیے آتے ہیں اور لوگوں کو پتہ نہیں ہوتا کہ اس قیام کا مقصد کیا ہے؟ جہاں تک میرا خیال ہے ہم اس دنیا میں اپنے ہی جیسے انسانوں کے لیے وجود رکھتے ہیں۔ اُن انسانوں کے لیے جن کی خوشیوں اور مسکراہٹوں میں ہماری مسرت مضمر ہے اور انسانوں کے لیے بھی جنھیں ہم ذاتی طور پر نہیں جانتے لیکن جن سے ہمارا ہمدردی اور رحم دلی کا رشتہ ہے۔ روزانہ دن میں تقریباً ایک سو مرتبہ میں اپنے آپ کو اس امر کی یاد دلاتا ہوں کہ میری زندگی کو بنانے میں دوسرے انسانوں جن میں زندہ اور دنیا سے رخصت ہو جانے والے سب کا حصہ ہے اور یہ کہ میرا اوّلین فرض بنتا ہے کہ میں بھی

ان کے احسانوں کا بدلہ انسانیت کی خدمت کر کے اور انھیں فیض پہنچا کر چکاؤں۔ ویسے کبھی کبھی میں اپنے محسنوں کی عنایات پر دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوتا ہوں کہ میں نے ان کو کس قدر زحمت دی ہے۔

میں یہ بات زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ سادگی میرے ایمان کا حصّہ ہے۔ سادہ زندگی سب لوگوں کے لیے ایک بہتر معیار ہے۔ سادگی اختیار کرنے سے ہم جسمانی اور ذہنی مصائب سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔

میں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے انسانی آزادی پر مکمل طور پر یقین نہیں رکھتا کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ انسان اندرونی اور بیرونی جبر میں گرفتار ہے جس کی بنا پر اسے لامحدود آزادی نصیب نہیں ہو سکتی خواہ وہ کسی بھی معاشرے میں رہتا ہو۔ خود شوپن ہاور نے ثابت کیا ہے کہ انسان اپنی ہر خواہش پوری نہیں کر سکتا اس لیے میں بے تحاشہ آزادی کا طالب ہی نہیں ہوں بلکہ میں اس دنیا میں سخت محنت کر کے مصائب سے گزر کر اور صبر و قناعت کا دامن ہاتھ میں تھام کر زندگی گزارنے کا قائل ہوں۔ اس سے مجھے ذہنی سکون عطا ہوتا ہے ورنہ میری زندگی مفلوج ہو جاتی اور یوں یہ خوش دلی زندگی میں حسُن پیدا کر دیتی ہے

ہر انسان کی طرح میرے بھی کچھ آدرش ہیں۔ میں حسن خیر نیکی کو عزیز رکھتا ہوں لیکن مادی آسائش اور خوش حالی کو مقصد نہیں جانتا۔ میرے مقاصد میرے آدرش ہی ہیں جو میری سعیٔ اور میری رائے کی سمت متعیّن کرتے ہیں۔ میں دولت کے جنون، ظاہری کامیابی اور عیش و عشرت جیسے گھٹیا آدرشوں سے نفرت کرتا ہوں اور انھیں بنی نوع انسان کے بجائے سوروں کے مقاصد جانتا ہوں۔ اور یہ سمجھتا ہوں کہ میرے جو آدرش ہیں وہ مجھے سائنسی تحقیق کے میدان میں ناقابلِ حصول کے حصول کا جذبہ عطا کرتے ہیں۔

جہاں تک سماجی انصاف اور ذمہ داری کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں میرا احساس عجیب و غریب طریقے سے دوسرے انسانوں اور انسانی برادریوں کے ساتھ براہ راست رابطے کی ضرورت کے برعکس رہا ہے۔ میں اپنی راہ پر چلتا ہوں، نہ میں اپنے دوستوں نہ وطن نہ اپنے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں یعنی سب سے الگ تھلگ رہتا ہوں حالاں کہ میں ان سب سے ہمدردی رکھتا ہوں۔ تنہائی کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ ایک شخص اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہمی مفاہمت اور ہمدردی کے امکان کی حدود کا بہت گہرا احساس رکھتے ہوئے بھی اسے ممکن نہیں سمجھتا۔ اس طرح کہیں کہیں تھوڑی سی خوشی سے وہ محروم ہو جاتا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا کرنے سے دوسرے لوگوں کی آراء، عادات اور فیصلوں سے آزاد ہو کر اپنی سوچ میں مگن رہتا ہے۔

میرا سیاسی آدرش ایسی جمہوریت ہے جس میں فرد کا احترام ہو۔ کسی کی پرستش نہ کی جاتی ہو۔ یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ میرے ساتھیوں نے ضرورت سے زیادہ میری تحسین و تعظیم کی اگرچہ اس میں نہ میرا قصور ہے اور نہ میری خوبیوں کا کوئی دخل ہے۔ اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ بہت سی وہ صلاحیتیں جو میں نے اپنی انتھک کوششوں سے پیدا کی ہیں، وہ دوسرے بہت سوں کے لیے ناقابلِ حصول ہیں۔ میں کسی طرح کے بھی استبدادی نظام کو جو کہ دھونس اور جبر پر مبنی ہوتا ہے، ناپسند کرتا ہوں۔ اس نظام میں گھٹیا اخلاقیات کے حامل حکومت کرتے ہیں۔ اور اگر حکمران ذہین بھی ہو تو اس کا جانشین بدذات قسم کا شخص ہی ہوگا کیوں کہ دخود جابر تھا۔ میں اٹلی کے فاشسٹ نظام اور روس کے اندر جاری وساری نظام کو ناپسند کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے امریکہ کا جمہوری نظام پسند ہے جہاں صدر ایک ذمہ دار شخص ہوتا ہے جو اتنے عرصے کے لیے منتخب ہوتا ہے کہ فرد کی فلاح و بہبود

کے لیے بہت کچھ کر سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسانی زندگی میں ریاست سے زیادہ اہمیت کی حامل وہ تخلیقی اور ذی حس شخصیت ہے جو عالی ظرفی برتری، ترفع اور اعلیٰ اخلاقیات کو جنم دیتی ہے۔ ورنہ عام انسان تو افکار و خیالات کے ضمن میں ٹھس ہوتا ہے۔

جنگ کو میں قابلِ نفرت چیز گردانتا ہوں۔ میں اس میں حصہ لینے کے مقابلے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا پسند کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہو گیا ہوتا اگر قوموں کے وہ تجارتی و سیاسی مفادات کار فرما نہ ہوتے جو ہمارے موجودہ اخباری نظام اور مختلف مدرسہ ہائے فکر کے ذریعے فعال رہتے ہیں۔

انسانی زندگی کا سب سے زبردست تجربہ پُراسراریت ہے۔ یہ ایک انوکھا و دلچسپ، تجربہ ہے۔ کائنات کی پراسراریت سے سچا فن اور سچی سائنس تخلیق ہوتی ہے۔ جو اس دنیا میں اشیا کو دیکھ کر حیران نہیں ہوتا، استعجاب محسوس نہیں کرتا وہ بجھی ہوئی موم بتی کی مانند ہے۔ پُراسراریت اور خوف کے انسانی جذبے نے مذہب کو تقویت بخشی ہے۔ ایک ایسی ہستی کا علم جسے ہم دیکھ نہیں سکتے لیکن محسوس کر سکتے ہیں۔

میں زندگی کی ابدیت اور حقیقت کے اس تھوڑے سے بہت ادراک کو کافی سمجھتا ہوں جو میں نے حاصل کیا ہے۔ میں کٹّر مذہبی آدمی ہوں۔ میرے لیے تو زندگی کی ابدیت کی پُراسراریت، حقیقت کی حیرت انگیز ساخت کا تھوڑا بہت ادراک اور وہ عقل یا فہم جو اپنے آپ کو فطرت میں ظاہر کرتی ہے کافی ہیں۔

مشاہیر یونان و رومہ

جلد اوّل

(حکیم پلوتارک یونانی کی کتاب "السیر" کا اردو ترجمہ)

مترجم

مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی

صفحات: ۵۳۰ — قیمت: ۶۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

انصاف: ۔ صفحات: ۲۴۵ ۔ قیمت: ۵۰ روپے
آئینہ: ۔ صفحات: ۳۶۴ ۔ قیمت: ۶۵ روپے
جوالامکھ: ۔ صفحات: ۳۶۸ ۔ قیمت: ۵۰ روپے

مصنف: ابوالفضل صدیقی

پتا: مکتبہ اسلوب پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۹ ۔ کراچی ۱۸

مشہور افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی کا پہلا افسانوی مجموعہ "اہرام" کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اب پورے ۴۳ سال کے بعد مکتبہ اسلوب کراچی کی جانب سے ان کے تین افسانوی مجموعے، "انصاف"، "آئینہ"، اور "جوالامکھ" ایک ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ اس طرح قاری کے لیے ابوالفضل صدیقی کے فن اور کارناموں کے مجموعی مطالعے کا ایک حد تک سامان فراہم ہوگیا ہے اور ان پر تحقیقی کام کرنے والے حضرات ان کے افسانوں کی تلاش میں مختلف رسائل و جرائد میں بھٹکنے سے بچ جائیں گے۔

ابوالفضل صدیقی افسانہ نگاروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو پانچویں دہائی میں یعنی ۱۹۳۶ء کے بعد منظرِ عام پر آئے۔ طرزِ نگارش اور مواد کے اعتبار سے ان کا تعلق جن افسانہ نگاروں کے حلقے سے بنتا ہے ان میں نمایاں نام آنجہانی پریم چند کا ہے۔ ان کے یہاں دیہات کو موضوعِ خاص کی حیثیت حاصل تھی۔ ۱۹۳۶ء کے بعد کے افسانے میں اگرچہ شہر داخل ہوچکا تھا۔ نئے لکھنے والوں کا زور شہری مسائل کی طرف تھا۔ اس کے باوجود ایسا نہیں ہوا کہ دیہات کا موضوع ترک ہوگیا ہو۔ کئی نئے افسانہ نگاروں کے لیے دیہات کا موضوع اب بھی پُرکشش تھا۔ انھیں میں ایک ابوالفضل صدیقی بھی تھے۔ ابوالفضل اپنے افسانوں میں جس ماحول کی عکاسی کر رہے تھے وہ جاگیردارانہ اور زمیندارانہ تھا۔ چوں کہ ابوالفضل صدیقی خود بھی اس طبقے کے نمائندہ تھے اس لیے دیہات کے منظر و پس منظر کو اس طبقے کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے میں آسانی تھی۔ اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ پریم چند نے عام طور پر دیہات کو نچلے اور درمیانے طبقے کے رُخ سے دیکھا اور دکھایا تھا، اس کا دوسرا رخ ابوالفضل کے توسط سے سامنے آیا۔ اس بنا پر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی کے افسانے پریم چند کے افسانوں کی ایک طرح سے توسیع ہیں۔ خود ابوالفضل کے افسانے کی خوب صورت توسیع قاضی عبدالستار کے افسانے میں دیکھی جاسکتی ہے۔

پینتیس چالیس سال اُدھر ابوالفضل صدیقی بہت پڑھے جاتے تھے۔ ادبی جرائد میں قاری کو ان کا شدت سے انتظار ہوتا تھا۔ آج سے پچاس سال اُدھر کے دیہات کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ان کے افسانے اب بھی پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ بہ حیثیت ایک اچھے افسانہ نگار کے ابوالفضل صدیقی کی شہرت گھر سے باہر بھی پہنچی۔ اُن کے افسانے "چڑھتا سورج" کو ۱۹۵۷ء میں یونسکو بین الاقوامی افسانوی انعام مل چکا ہے۔ اُن کی افسانہ نگاری کے ضمن میں اُن کے فن اور اسلوب کے حوالے سے بحث کی گنجائش موجود ہے۔ اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی افسانہ نگاری میں ایک صاحبِ مقام فن کار ہیں۔ افسانوی ادب کی کوئی تاریخ اپنے تسلسل کو برقرار رکھنے کے عمل میں انھیں پھلانگ کر نہیں گزر سکتی۔ اُن کی حیثیت اِس راہ میں اب ایک سنگِ میل کی ہے۔

ابوالفضل صدیقی نے افسانے کے ساتھ ساتھ ناول لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اُن کا ایک ناول "تعزیر" ۱۹۴۶ء اور دوسرا ناول "سرور" ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ تیسرا ناول "ترنگ" طباعت کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اُن کے افسانے عام طور پر طویل ہوتے ہیں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ طویل افسانے کی روایت کو ابوالفضل صدیقی سے تقویت ملی ہے۔ اُن کے بعض افسانے اتنے طویل ہیں کہ آسانی سے ناولٹ کے چوکھٹے میں فٹ کیے جاسکتے ہیں ــــ کتابیں دیدہ زیب چھپی ہیں اور قابلِ مطالعہ ہیں۔

کچھ دیر پہلے نیند سے = مصنف: شکیلہ رفیق (۱۔س)

صفحات: ۱۹۱۔ قیمت: درج نہیں

پتا: مکتبۂ نیا دور۔ کراچی

شکیلہ رفیق کی کہانیوں کو پڑھ کر چوپال کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ جہاں ایک شخص کہانی سنا رہا ہے اور بہت سے اُسے محویت سے سن رہے ہیں۔ اُن کی اکثر کہانیوں کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی منصوبہ بندی نہیں ہے۔ خود رو ہیں۔ منصوبہ بندی فنّی اعتبار سے کسی کہانی کی چول تو درست کر سکتی ہے لیکن ایسا کرنے سے بعض اوقات اس کا چہرہ کڑا معلوم ہونے لگتا ہے۔ شکیلہ رفیق کی کہانیاں اپنی صورت میں وہی کچھ دکھائی دیتی ہیں جیسی وہ حقیقت میں ہوتی ہیں ایسا نہیں ہوتا کہ ذہن و خیال سے کاغذ تک آتے آتے اُن کی صورت ایسی بدل جائے کہ خود تخلیق کار سے بھی نہ پہچانی جاسکے۔

شکیلہ رفیق کا اسلوبِ اظہار بیانیہ ہے، انھوں نے اپنی بیشتر کہانیاں اسی پیرائے میں لکھی ہیں۔ عورت، اس کا معاشرے میں مقام اور اس کے دکھ درد اُن کی کہانی کا خاص موضوع ہیں۔ البتہ موضوع تک رسائی کا انداز اُن کا اپنا ہے۔ ایک کہانی استقبالیہ بیانیہ اسلوبِ اظہار سے ہٹ کر علامتی پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ جن کا ذکر مشہور افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی اور عصمت چغتائی دونوں نے اچھے انداز میں کیا ہے۔

شکیلہ رفیق کی یہ کہانی ایک ایسی الم رسیدہ خاتون کی کہانی ہے جس نے خواہ وجہ کچھ بھی ہو، اپنے اردگرد چہار دیواری تعمیر کر لی ہے۔ سماج اور حالات کے جبر کی وجہ سے وہ خود پر اس پابندی کو قائم بھی رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن جب کبھی اس کے دروازے پر دستک ہوتی ہے تو اس کا دل نامعلوم خوشی سے چھلک پڑتا ہے۔ اور دروازہ کھول کر دستک دینے والے کے ساتھ سفر کے انجام سے بے خبر چل پڑتی ہے۔ لیکن جلد ہی یہ پُرمسرّت لمحہ لہولہان ہو جاتا ہے۔ اس کی واپسی اپنے کلبۂ احزاں میں ہوتی ہے۔ کبھی بھونرے کے بہلاوے میں، کبھی پھول کے کہنے پر اور کبھی پرندے کی باتوں میں آکر وہ بار بار اس تجربے سے گزرتی ہے لیکن ہر بار تلاشِ مسرّت کے بے اختیار جذبے کو لہولہان ہونا

پڑتا ہے۔ مآل کار پھر وہی کلبۂ احزان۔ بار بار کے صدمات سے تنگ آ کر وہ بادلِ ناخواستہ اب ہر آنے والے کو مایوس لوٹانے پر مجبور ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ہوا اور روشنی کو بھی۔ وہ یہ جانتے ہوئے کہ کال کوٹھری اس کا مقدر ہے۔ مگر کہیں اس سے نجات حاصل ہوگی، پھر بھی نجات کے خوب صورت خواب دیکھتی اور ہر آہٹ پر چونکتی رہتی ہے۔ تا آنکہ پھر اس کے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ وہ پوچھتی ہے کون؟ جواب ملتا ہے "موت" اور وہ دروازہ کھول دیتی ہے۔"

افسانہ "**استقبال**" کے تجزیہ کا ایک رخ یہ ہے جس کا اظہار یہاں کیا گیا ہے۔ اس افسانے کی تفہیم دوسری سطحوں سے بھی کی جا سکتی ہے کیوں کہ یہ افسانہ اپنے اندر تہہ داری رکھتا ہے۔

"درد کا ملاپ" اچھا افسانہ ہے۔ اس کی تفسیر یوں ہو سکتی کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، جھگڑا حقِ ملکیت کا ہے۔ جب ملکیت ختم ہو جاتی ہے تو جھگڑا بھی باقی نہیں رہتا۔

"برف کا دھواں" کا موضوع "بانجھ" مرد کا ہے۔ یہ موضوع عورتوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔

کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ سرورق صادقین نے بنایا ہے۔ طباعت دیدہ زیب ہے۔

(ا۔س)

اقرا (چوتھا شمارہ۔ نومبر ۱۹۸۵ء) **مجلس ادارت**: بریگیڈیر سید صفدر نواب اور رشید امجد

صفحات: ۵۶۰۔ قیمت: ۷۰ روپے

پتا: نظامتِ وفاقی تعلیمی ادارہ جات۔ جی ایچ کیو راولپنڈی۔

اس وقت جب کہ تعلیمی ادارے سیاست کے اکھاڑے بنتے جا رہے ہیں جی۔ ایچ۔ کیو راولپنڈی کا یہ اقدام نہایت مستحسن ہے کہ اس نے تعلیمی مسائل پر مقالے اور مضامین لکھوا کر اپنے مجلہ "اقراء" میں شائع کیے۔ یہ مجلہ ایک ضخیم کتاب کی شکل میں منظرِ عام پر آیا ہے اور اس میں تعلیم سے متعلق جملہ مسائل کو مضامین اور مقالوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض مضامین براہ راست اردو میں لکھے گئے ہیں اور بعض دوسری زبانوں خصوصاً انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ چونکہ ان مضامین میں لکھنے والے اکثر حضرات کا تعلق ملک کے نظامِ تعلیم سے ہے اس لیے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔

قارئین کی سہولت کے لیے جملہ مضامین کو ان کی نوعیت کے اعتبار سے دس حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور چوں کہ بعض حصوں میں جو مسائل بیان ہوئے ہیں ان کا پھیلاؤ زیادہ ہے اس لیے ان کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے ذیلی عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں دنیا کے مختلف ممالک کے نظامِ تعلیم سے متعلق مضامین ہیں اس لیے یہ حصہ ان لوگوں کے لیے بے حد مفید اور معلوماتی ہے جو اس سلسلہ میں کوئی تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں یا جو مختلف ممالک کے تعلیمی نظاموں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اپنے ملک کے تعلیمی نظام کو صحیح خطوط پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔

دوسرے حصے میں وہ مضامین جمع کر دیے گئے ہیں جن میں تعلیم کے مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں پہلا مضمون "اسلامی نصاب کی جانب ایک قدم" نہایت فکر انگیز ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم نے تعلیم کا کیا مقصد بتایا ہے۔ لیکن ہم نے اس مقصد کو نظر انداز کر کے صرف "مقصدِ زر اندوزی" کو اپنے سامنے رکھا ہے اسی لیے اس راہ میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ اور تعلیم کی برکتوں سے محروم ہیں، لہٰذا ہمیں اگر تعلیم کو جزوِ حیات اور ذریعۂ نجات بنانا ہے تو ہمیں لازمی طور پر اپنی تعلیم کے

مقصد کا تعین قرآن کریم کی روشنی میں کرنا چاہیے۔

تیسرے حصے میں ایسے مضامین جمع کر دیے گئے ہیں جن میں ذریعہ تعلیم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں پہلا مضمون جو پروفیسر کرم حیدری صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود نہایت دل چسپ اور مفید ہے۔ انھوں نے دورِ غلامی کی نشانی "انگریزی زبان" کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کو اپنی قوم کے لیے نہ صرف مضرت رساں بلکہ مہلک بتایا ہے اور یہ تجویز پیش کی ہے کہ اپنی مادری اور قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور جدید علوم کو ان کے ماہرین سے اپنی زبان میں منتقل کرا کر چند آدمیوں کی محنت سے پوری قوم کو استفادہ کا موقع دیا جائے۔ اس طرح قوم کا بیشتر سرمایہ بھی ضیاع سے بچ جائے گا اور قوم کی تعلیم بھی صحیح خطوط پر ہو سکے گی۔

بعد کے حصوں میں مختلف مفکرینِ تعلیم کے نظریات، تعلیم کے فلسفیانہ اور عمرانی پہلو، مختلف مضامین کی تعلیم، کمرۂ جماعت کے مسائل، پاکستان میں تعلیم کے بعض مسائل وغیرہ جیسے موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

غرض پورا مجلہ تعلیمی مسائل پر ایک جامع اور قیمتی دستاویز ہے۔ بے جا نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ تعلیم کے سلسلہ میں یہ ایک مختصر سا ادارۃ المعارف ہے جو ملکی و قومی تعلیم پر کام کرنے والوں کے لیے ایک "گائیڈ بک" کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کو بہت سے ماخذ کو ٹٹولنے کی زحمت سے بچا دیتا ہے۔ اس کے مرتبین لائقِ تحسین اور پوری قوم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

(ثناء الحق صدیقی)

اصطلاحاتِ پیشہ وراں

جلد اوّل تا پنجم

مولفہ

مولوی ظفر الرحمٰن دہلوی

قیمت: ۱۱۰ روپے مکمل سیٹ کے لیے

انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی

گرد و پیش

چینی ادیبوں کے وفد کی انجمن میں آمد

حکومتِ پاکستان کی دعوت پر چینی ادیبوں کا ایک وفد ان دنوں پاکستان آیا ہوا ہے۔ ۱۳؍اپریل ۱۹۸۶ء کو وفد کے اراکین انجمن ترقی اردو تشریف لائے۔ وفد کے اراکین نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مزار پر پھول چڑھائے اور کتب خانۂ خاص کا معائنہ کیا۔ چینی ادیبوں کو انجمن کی مطبوعات کے علاوہ اردو زبان میں شائع ہونے والی وہ کتابیں بھی دکھائی گئیں جو چین کی تاریخ، ثقافت، علوم اور ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔ چینی ادیبوں نے اس ذخیرے کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ چین کی ایک تاریخ جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور ۱۸۴۷ء کی شائع شدہ ہے، اس ذخیرے کی سب سے قدیم کتاب تھی۔ چینی ادیبوں کے وفد نے اس نادر کتاب کو بہت پسند کیا۔

اس موقعے پر ناظم انجمن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر چینی ادیبوں کی انجمن، انجمن کے ماہنامے قومی زبان کے لیے چین کے نئے ادب کے تراجم فراہم کرتی رہے تو اس سے دونوں ملکوں کے درمیان باہمی افہام و تفہیم کی بہتر صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ چینی وفد کے قائد نے اس تجویز کو پسند کیا اور اس سلسلے میں اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

بعد ازاں انجمن کی جانب سے چینی وفد کے اعزاز میں ایک مقامی ہوٹل میں ظہرانہ دیا گیا۔ ظہرانے میں متولیانِ انجمن کے علاوہ جناب غلام ربانی اگرو ناظم عمومی اکادمی ادبیاتِ پاکستان بھی شریک تھے۔ ظہرانے میں انجمن کے ناظم اعزازی نے پاک چین دوستی کے استحکام کا جامِ صحت تجویز کیا اور انجمن کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی نے انجمن، اراکینِ انجمن اور انجمن کے کارناموں کا تفصیلی تذکرہ کیا۔ وفد کے قائد نے اپنی گفتگو علامہ اقبال کی مشہور نظم "شاعر" کے حوالے سے شروع کی اور "شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم" کو بنیاد بنا کر اہلِ قلم اور معاشرے کے باہمی ربط کو اجاگر کیا اور انجمن کی کارکردگی کے بارے میں خوشنودی کا اظہار کیا۔

(انجمن رپورٹ)

ملتان میں انجمن کی جانب سے تقریب کا اہتمام

۲۰؍مارچ ۱۹۸۶ء کو شام ۴ بجے جناح ہال ملتان میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیرِ اہتمام ایک تقریبِ تعارف و جائزہ منعقد ہوئی۔ صدر نشین انجمن جناب قدرت اللہ شہاب نے صدارت فرمائی۔ اس تقریب کا مقصد یہ تھا کہ انجمن کی تاریخ اور کارناموں سے ملتان کے اہلِ قلم کو آگاہ کیا جائے اور یہ واضح کیا جائے کہ انجمن کی جد و جہد میں شرکت کرنا قومی فریضہ انجام دینا ہے۔ مقررین میں ڈاکٹر طاہر عبدالحق، پروفیسر سید شمیم حیدر ترمذی، پرنسپل عاصی کرنالی اور مشہور قومی کارکن منشی عبدالرحمٰن شامل تھے۔ جناب عاصی کرنالی نے جیون کتھا کے عنوان سے انجمن کی داستان بڑے دل نواز پیرائے میں بیان کی (یہ داستان اسی شمارے میں شامل ہے) منشی عبدالرحمٰن نے اپنی تقریر میں

نفاذِ اردو میں تاخیر کے بارے میں بڑی بصیرت افروز باتوں کی نشاندہی کی۔

اس تقریب میں ملتان ڈویژن کے نمائندہ ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ (انجمن رپورٹ)

اُردو منی کمپیوٹر اور منی کمپوزر

مقتدرہ قومی زبان رواں سال کے دوران اشاعتی کام کی سہولت اور ملک میں اُردو زبان کے فروغ کے لیے ایک اُردو منی کمپیوٹر اور منی کمپوزر متعارف کرائے گی۔ یہ بات مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشیں ڈاکٹر وحید قریشی نے بتائی۔ منی کمپوزر کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اسے۔ آئی۔ بی۔ ایم کی طرز پر تشکیل دیا جائے گا جس سے کتابوں کی جلد اشاعت میں مدد ملے گی۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ۲۱ جلدیں مکمل ہوگئیں

(اُردو نامہ)

اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ۲۱ جلدیں مکمل ہوگئی ہیں۔ یہ کام پنجاب یونیورسٹی کا متعلقہ شعبہ سرانجام دے رہا ہے۔ واضح رہے کہ اس کی کُل جلدیں ۲۵ ہوں گی۔ (اُردو نامہ)

فروغ اُردو کے لیے خدمات انجام دینے پر ایوارڈ

بھارتی صدر نے اُردو کے فروغ اور ترقی کے لیے خدمات انجام دینے پر پندرہ ادیبوں کو ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء کے غالب ایوارڈ دیے۔ ایوارڈ کے سلسلے کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اُردو ان بڑی زبانوں میں سے ہے جن سے عوام کو آزادی کی تحریکوں میں حصّہ لینے کی تحریک ملی۔ ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں پروفیسر مختار الدین احمد، یونس دہلوی، صلاح الدین، عبدالرحمٰن، شیلہ بھاٹیہ، ناز انصاری، پروفیسر ابو محمد سحر، فضل الرحمٰن، فکر تونسوی، سیّد مختار الزماں، خواجہ احمد عباس، میکش اکبرآبادی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور یوسف ناظمی شامل ہیں۔ ناز ش پرتاب گڑھی کو یہ انعام بعد از مرگ دیا گیا۔ ایوارڈ کے ساتھ دس ہزار روپیہ نقد اور ایک طلائی تمغہ دیا جاتا ہے۔ (ہماری زبان۔ دہلی)

رشید احمد صدیقی پر دستاویزی فلم

صاحبِ طرز انشاء پرداز اور مشہور مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اتر پردیش جن وادی لیکھک سنگھ کی طرف سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں ۱۳ر فروری ۸۶ء کو ایک سمینار کا اہتمام کیا گیا۔ اس سمینار میں لیکھک سنگھ کے صدر پروفیسر قاضی عبدالستار نے یہ انکشاف کیا کہ لکھنؤ دوردرشن نے رشید احمد صدیقی کی حیات، شخصیت اور کارناموں پر ایک دستاویزی فلم بنانے کا فیصلہ کیا ہے (ہماری زبان، دہلی)

ڈاکٹر عبدالسلام کا عطیہ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایک تقریب میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام نے تہذیب الاخلاق ٹرسٹ کو اپنی طرف سے ایک ہزار ڈالر کا گران قدر عطیہ دیا ہے۔ واضح رہے کہ تہذیب الاخلاق رسالہ اور ٹرسٹ سرسیّد احمد خاں نے قائم کیا تھا۔ (ہماری زبان دہلی)

انجمن ترقی اردو کی جانب سے اقبالیات پر لیکچر کا اہتمام

گزشتہ دنوں معروف اقبال شناس اور شاعر پروفیسر جگن ناتھ آزاد ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے کراچی آئے ہوئے تھے ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر انجمن ترقی اردو پاکستان نے ۲۶ مارچ ۸۱ء کو ایک مقامی ہوٹل میں ان کے ساتھ ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ اس تقریب کی صدارت معروف شاعر جناب شان الحق حقی نے فرمائی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے بے شمار مضامین کے علاوہ مہمان مقرر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد معروف شاعر ہونے کے علاوہ ایک بڑے اسکالر بھی ہیں۔ اور علامہ اقبال کے بارے میں اب تک دس کتابیں مرتب کر چکے ہیں۔ ان دنوں وہ اقبال کے سوانح مرتب کر رہے ہیں جس کی پہلی جلد تیار ہو چکی ہے۔ دوسری جلد پر کام جاری ہے۔

پروفیسر آزاد کی تقریر کا موضوع "ہندستان میں اقبالیات" تھا۔ موصوف نے ابتدا میں اُس صورتِ حال کا تفصیلی جائزہ لیا جس سے آزادی کے بعد ہندستان میں علامہ اقبال، ان کے ہمدردوں اور پرستاروں کو گزرنا پڑا۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے پانچ سات سال بعد تک اقبال شناسی کے سلسلے میں سناٹا رہا اور اردو بھی معرضِ عتاب میں تھی۔ اردو چوں کہ ہندستان کے بہت بڑے طبقے میں بولی جانے والی زبان تھی اس لیے اس کی پذیرائی کسی نہ کسی طرح ہو رہی تھی لیکن لوگ اقبال کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ کیوں کہ وہ تصورِ پاکستان کے بانی تھے۔ بہرحال عصبیت کسی طرح کی بھی ہو، بہت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اقبال کے سلسلے میں بھی یہی ہوا۔ آہستہ آہستہ اقبال کی پذیرائی شروع ہوئی۔ ڈاکٹر محمد حسن اور دیگر اقبال پرستوں کے اشتراک سے پروفیسر آزاد نے کشمیر میں ایک اقبال نمائش کا اہتمام کیا جس میں اقبال کے تعلق سے ۱۷۵ تصاویر رکھی گئیں۔ نمائش کا افتتاح شیخ عبداللہ نے کیا تھا جنھیں علامہ اقبال سے ملاقات کا شرف بھی حاصل تھا۔ اخبارات نے اقبال نمائش کی خبریں شہ سرخیوں کے ساتھ اس طرح دیں جیسے وہ سب بھی اسی دن کے انتظار میں تھے۔

چنانچہ اخبارات میں نمائش کی خبروں کی اشاعت کے بعد دوسرے شہروں اور دیگر اداروں پر اس کے خوش گوار اثرات مرتب ہوئے۔ حیدرآباد دکن میں اقبال اکادمی قائم ہوئی اور دوسری جگہوں پر بھی اقبال شناسی کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے بیان کے مطابق ہندستان میں ۱۹۷۷ء میں منعقد ہونے والی اقبال صدی کی تقریبات کی تیاری کا سلسلہ ۱۹۷۳ء میں شروع ہو گیا تھا۔ ان تقریبات کا سلسلہ تاحال کسی نہ کسی عنوان جاری ہے۔ ایک خوش آئند خبر یہ ہے کہ بھوپال کا شیش محل جہاں علامہ اقبال قیام فرمایا کرتے تھے، حکومتِ ہند نے اقبال اکیڈمی کے حوالے کر دیا ہے۔ اب تک ۲۱ یونیورسٹیوں میں اقبال چیئر کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ اس کا آغاز کشمیر یونیورسٹی سری نگر سے ہوا۔ پروفیسر آزاد نے بتایا کہ اقبال انسٹی ٹیوٹ نے پروفیسر آل احمد سرور کی سربراہی میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ ہماری مشترکہ مساعی بارآور ہوئی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی ہم اس مقام پر آگئے ہیں جہاں اقبال کے کلام و افکار پر ہر جگہ آزادی سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ اردو اور اقبال کے بارے میں اب صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر کی جانب سے اقبال پر ہر سال دو سمینار منعقد ہوتے ہیں۔ ہندستان کی ۵۵ یونیورسٹیوں میں اقبال کے لیے خصوصی مطالعے کا انتظام ہے۔ ہندستان کی مختلف اردو اکادمیوں میں کام ہو رہا ہے۔ اقبال کے موضوع پر ظ۔ انصاری، علی سردار جعفری، آل احمد سرور، صباح الدین عبدالرحمن، وحید اختر اور ہریانہ کے گورنر مظفر حسین برنی کی کتاب منظرِ عام پر آچکی ہے۔ پروفیسر آزاد کی تقریر

سے پہلے ایک نوجوان مصوّر علیم احمد نے علامہ اقبال کی ایک تصویر پیش کی جو انھوں نے انجمن کو نذر کرنے کے لیے بطورِ خاص بنائی تھی۔

صدرِ جلسہ جناب شان الحق حقّی نے اپنے مختصر صدارتی خطبے میں پروفیسر آزاد کی تقریر کو سراہا اور کہا کہ آزاد صاحب نے اقبال کے مطالعے میں کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے اضافہ کیا ہے۔ ان کی یہ تقریر کئی پہلوؤں سے بصیرت افروز ہے۔ تقریب کے اختتام پر انجمن کے ناظمِ اعزازی جناب نور الحق جعفری نے پروفیسر آزاد اور مہمانِ گرامی کا شکریہ ادا کیا۔

(انجمن رپورٹ)

جدّہ میں بین الاقوامی اقبال ایوارڈ کمیٹی کا قیام

جدّہ میں مقیم برصغیر پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے اردو ادیبوں اور دانشوروں کے ایک اہم اجلاس میں بین الاقوامی اقبال ایوارڈ کمیٹی کا قیام اتفاق رائے سے عمل میں لایا گیا۔ یہ کمیٹی ہر سال شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی حیات، فکر اور شخصیت کے مختلف گوشوں پر دنیا بھر میں اور مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے کام کا جائزہ لے کر ایوارڈ کا اعلان کیا کرے گی۔ جس میں دنیا بھر کے مختلف اہم ممالک کے سرکردہ نمائندہ ادیبوں اور دانشوروں پر مشتمل ایک مشاورتی کمیٹی کی سفارشات بھی مدِّ نظر رکھی جائیں گی۔

بین الاقوامی اقبال ایوارڈ کمیٹی کے اس تاسیسی اجلاس میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ اتّفاق رائے سے سال ۱۹۸۲ء کا بین الاقوامی ایوارڈ مشہور ماہرِ اقبالیات اور عربی اسکالر جناب محمد بن خلیل عرب شکیب مرحوم کو بعد از مرگ پیش کیا جائے۔ مرحوم شکیب گزشتہ بیس برس سے اقبالیات کے سلسلے میں اہم اور قابلِ تحسین کام کر رہے تھے۔ بالخصوص عربی زبان میں اقبال کو متعارف کرانے کی اہم کوششوں میں وہ پیش پیش تھے۔ معتمد عمومی جناب نسیم سحر نے اجلاس کو مطلع کیا کہ ایوارڈ کی رقم مبلغ گیارہ ہزار پانچ سو روپے پر مبنی ڈرافٹ مرحوم کے صاحبزادے حمّاد بن محمد کو روانہ کیا جا چکا ہے۔

بین الاقوامی اقبال ایوارڈ کمیٹی کی صدارت کے لیے بیرسٹر محمد رشید شیخ کو منتخب کیا گیا ہے۔ جدّہ میں مقیم پاکستانی شاعر اور ادیب نسیم سحر کو معتمد عمومی، ہندستان سے تعلق رکھنے والے ادیب اور شاعر بیکس نواز شارق معاون معتمد اور پاکستان کے معروف شاعر و صحافی شاہد نعیم کو معتمد نشر و اشاعت مقرر کیا گیا ہے۔ درج ذیل ادیب اور دانشور کمیٹی کے اساسی ارکان شمار ہوں گے۔

جناب اعتماد صدیقی، جناب بیرسٹر محمد رشید شیخ، جناب رؤف خلش، جناب نسیم سحر، جناب شاہد نعیم، جناب بیکس نواز شارق، جناب مصلح الدین سعدی، جناب سجّاد بابر، جناب محمد طارق غازی، جناب ضیاء الدین نیّر، جناب ناظر قدوائی، جناب سیّد ابوظفر، اور ڈاکٹر عباد الرحمن عرفی۔

(رپورٹ نسیم سحر)

عبد الغفور نسّاخ

مولفہ

ڈاکٹر صدر الحق

قیمت: ۳۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

ردِ عمل

ڈاکٹر کلیم سہسرامی

راجشاہی (بنگلہ دیش)

فروری ۱۹۸۶ء کے شمارے میں "مولانا ابوالکلام آزاد کی پہلی غزل" کے عنوان سے جو مقالہ شائع ہوا ہے اس کے مندرجات سہ ماہی "اُردو ادب" (زیرِ ادارت آل احمد سرور) میں تقریباً بارہ، چودہ سال قبل زیرِ بحث آچکے ہیں۔ اس کے بعد ہی مانوس سہسرامی کی وساطت سے سہسرام میں مولوی عبدالواحد مرحوم کے مزار کی نشاندہی کی تھی۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد اور مولوی عبدالواحد سہسرامی کے تعلقات پر میرے پاس اتنا مواد ہے کہ ایک مضمون مرتّب ہو سکتا ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے صـ۳۲ پر یہ تحریر کیا ہے کہ "ارمغانِ فرخ" کے پرچے ہنوز کہیں دستیاب نہ ہو سکے اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے کس شمارے میں مولانا کی یہ غزل شائع ہوئی تھی اس سلسلے میں ڈاکٹر میمونہ دلوی کی کتاب "بمبئی میں اردو" سے یہ چند سطریں نقل کر رہا ہوں۔ جس سے اس موضوع پر مزید روشنی پڑتی ہے اور مولانا کی شاعری کی ابتدا کے بارے میں فاضل مقالہ نگار کا قیاس درست معلوم ہوتا ہے۔ محترمہ لکھتی ہیں:

"حکیم عبدالحمید فرخ دہلوی نے اکتوبر ۱۸۹۸ء میں ایک گلدستہ "ارمغانِ فرخ" کے نام سے شائع کرنا شروع کیا، ۲۸ صفحات کا یہ گلدستہ مطبع حمیدی سے شائع ہوتا تھا۔ .... یہ رسالہ ہر مہینے کے پہلے پیر کو شائع ہوتا تھا۔" (صـ۳۲۳)

میں ۷ مارچ کو تہران چلا گیا تھا، وہاں علامہ اقبال پر ایک سمینار تھا جس کی تفصیلی رپورٹ "قومی زبان" کے لیے منسلک کر رہا ہوں اور اسی کے ساتھ "قتیل دانا پوری کی شاعری" پر ایک مقالہ بھی ارسال ہے۔

ممتاز احمد خاں

کراچی

"قومی زبان" مارچ ۱۹۸۶ء کا شمارہ ملا۔

اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ "قومی زبان" ترقی کے مراحل سے گزر رہا ہے اور اس کے قارئین بجا طور پر یہ توقع کر سکتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں اس میں مزید دلچسپ تبدیلیاں رونما ہوں گی۔

موجودہ شمارے میں ناول کے احیا اور ارتقا کے سلسلے میں ڈاکٹر فہیم اعظمی صاحب کا مضمون میں نے بہت توجہ سے پڑھا۔ یہ مضمون خاصا معلوماتی اور دلچسپ بھی ہے۔ فہیم صاحب نے اس مختصر سے مضمون میں انگلستان، فرانس، روس اور امریکہ کے ادبی ناولوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا لیکن جرمنی کے ناولوں اور ناول نگاروں کو نظر انداز کر گئے۔ وہاں کے ناول نگاروں میں ہرمن ہیسے اور ٹامس مان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ووذرنگ ہائٹس WUTHERING HEIGHTS ایملی برانٹے کا ناول ہے اسے انھوں نے شارٹ برانٹے سا ناول لکھا ہے۔ شاید ایسا نادانستہ طور پر ہوا ہے۔ پھر یہ کہ انھوں نے اردو ناولوں کے ضمن میں بانو قدسیہ کے ناول "راجہ گدھ"، نثار عزیز بٹ کے ناول "کاروانِ وجود"، اور عبداللہ حسین کے ناول "باگھ"، کا تذکرہ نہیں کیا جو کہ ازحد ضروری تھا۔ گو کہ انھوں نے لکھا ہے کہ بہت سے ناول نگاروں اور ناولوں کا ذکر نہ آسکا۔ تاہم مذکورہ بالا تین ناول نگاروں کا ذکر، انتظار حسین اور انیس ناگی ہی طرح مضمون کے سیاق و سباق میں ناگزیر تھا۔ لیکن چوں کہ وہ انگریزی ناولوں پر طبع آزمائی کر رہے ہیں لہٰذا ان اہم ناول نگاروں کا تذکرہ ان کے دیگر مضامین میں ضرور آئے گا۔

مجھے امید ہے کہ ناولوں اور ناول نگاروں پر مضامین کا سلسلہ "قومی زبان" جاری رکھے گا۔ اس لیے کہ فکشن کے اس میدان میں تسلی بخش کام نہیں ہوا ہے۔ پھر یہ کہ جس طرح افسانے کے مسائل کے بارے میں وقتاً فوقتاً مضامین شائع کیے جا رہے ہیں بہتر ہو اگر **ناول** کے مسائل کے بارے میں بھی مضامین چھاپے جائیں تاکہ ان سے ناول نگاروں کی رہنمائی ہو اور ہمارے یہاں پہلے سے بھی بہتر ناول تصنیف کیے جا سکیں۔

مخطوطات انجمن ترقی اردو

جلد اوّل تا ششم

مولفہ

افسر صدیقی امروہوی

قیمت: ۱۰۲ روپے مکمل سیٹ کے لیے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی

حرفِ تازہ

کتابیں

○ **بہ حضور خاتم الانبیاء** = مصنّف راغب مرادآبادی

صفحات: ۱۶۸ - قیمت: ۴۰ روپے، بیرونِ ملک ۵ امریکی ڈالر

پتا: ۱۶/۱۱۰۱، فیڈرل بی ایریا، کراچی ۳۸ (پاکستان)

○ **ن۔م راشد - ایک مطالعہ** = مرتّب: ڈاکٹر جمیل جالبی

صفحات: ۳۷۶ - قیمت: ۷۰ روپے

پتا: مکتبہ اسلوب پوسٹ بکس ۲۱۱۹ - کراچی ۱۸ (پاکستان)

○ **سلسلہ سوالوں کا** = مصنّف: احمد ہمدانی

صفحات: ۱۵۲ - قیمت: ۳۰ روپے

پتا: مکتبہ اسلوب پوسٹ بکس ۲۱۱۹ کراچی ۱۸ (پاکستان)

○ **انصاف** = مصنّف ابوالفضل صدیقی

صفحات: ۲۴۴ - قیمت: ۵۰ روپے

پتا: مکتبہ اسلوب پوسٹ بکس ۲۱۱۹ کراچی ۱۸ (پاکستان)

○ **آئینہ** = مصنّف: ابوالفضل صدیقی

صفحات: ۳۲۴ - قیمت: ۶۵ روپے

پتا: مکتبہ اسلوب پوسٹ بکس ۲۱۱۹ کراچی ۱۸ (پاکستان)

○ **منٹو (نوری نہ ناری)** = مصنّف ممتاز شیریں، مرتّب: آصف فرخی

صفحات ۱۶۸ - قیمت: ۳۵ روپے

پتا: مکتبہ اسلوب پوسٹ بکس ۲۱۱۹ کراچی ۱۸ (پاکستان)

○ **جوالا مکھی** = مصنّف: ابوالفضل صدیقی

صفحات: ۲۶۸ - قیمت: ۵۰ روپے

پتا: مکتبہ اسلوب پوسٹ بکس ۲۱۱۹ کراچی ۱۸ (پاکستان)

○ **فکشن۔ فن اور فلسفہ** = مترجم مظفر علی سید

صفحات: ۲۱۶۔ قیمت: ۴۵ روپے

پتا: مکتبہ اسلوب پوسٹ بکس ۱۱۹ ۲ کراچی ۱۸ (پاکستان)

○ **تماشائے اہلِ کرم** = مصنف: کرنل مسعود اختر شیخ

صفحات: ۱۶۳۔ قیمت: ۴۵ روپے

پتا: اشاعت پبلی کیشنز۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۴۸، راولپنڈی (پاکستان)

○ **منظر میرے دریچوں سے** = مصنف: خاور احمد

صفحات: ۱۲۸۔ قیمت: ۳۰ روپے

پتا: عظیم پبلی کیشنز پوسٹ بکس نمبر ۷۴۹۲، کراچی ۳ (پاکستان)

○ **گرین کارڈ** = مصنف: ڈاکٹر فرخندہ جمال

صفحات: ۲۶۰۔ قیمت: ۶۶ روپے

پتا: فیروز سنز، لاہور، کراچی، راولپنڈی (پاکستان)

○ **آئینے کے اُس طرف** = مصنف: عالم تاب تشنہ

صفحات: ۲۰۷۔ قیمت: ۴۰ روپے

پتا: ایوانِ ادب، سی ۵۳۔ بلاک ۹، گلشنِ اقبال۔ کراچی (پاکستان)

○ **تقدیس** = مصنف: تابش دہلوی

صفحات: ۸۲۔ قیمت: ۴۰ روپے

پتا: بلاک ۳۔ اے ۶/۹ ناظم آباد، کراچی ۱۸ (پاکستان)

○ **سحرِ حلال** = مصنف: شہاب رحمت اللہ

صفحات: ۲۱۲۔ قیمت: ۴۰ روپے

پتا: بی۔ ون سالمینا فلیٹ۔ خیابانِ جامی، کلفٹن۔ کراچی (پاکستان)

○ **دائرے اور لکیریں** = مصنف: ڈاکٹر وزیر آغا

صفحات: ۱۹۴۔ قیمت: ۳۰ روپے

پتا: مکتبۂ فکر و خیال ۲/۱۷ ستلج بلاک۔ اقبال ٹاؤن، لاہور (پاکستان)

○ **علمِ صحافت** = مصنف: اسلم ڈوگر

صفحات: ۶۸۔ قیمت: ۲۰ روپے

پتا: تاج بک ڈپو، اردو بازار۔ لاہور (پاکستان)

جریدے

○ ماہنامہ "رسالہ" = مرتبین: حبیب ارشد، عتیق جیلانی، قمر مشتاق
صفحات: ۲۸۷۔ قیمت: ۶۹ روپے
پتا: مکتبہ جلیانِ ادب۔ حیدرآباد، سندھ (پاکستان)

○ "کلاسیک" = مرتبین: احمد داؤد، ظہیر الدین احمد
صفحات: ۶۱۳۔ قیمت: مجلد ۷۰ روپے۔ پیپر بک: ۶۰ روپے
پتا: بک لینڈ سیروز سنیما بلڈنگ۔ صدر، راولپنڈی (پاکستان)

○ "ادب لطیف" = مدیر اعلیٰ، صدیقہ بیگم
صفحات: ۱۱۲۔ قیمت: ۵ روپے
پتا: ۶ سی دربار مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

○ "اوراق" = (خاص نمبر) مدیر: وزیر آغا
صفحات: ۳۸۴۔ قیمت: ۳۰ روپے
پتا: دفتر اوراق۔ چوک اردو بازار۔ لاہور (پاکستان)

○ ماہنامہ "حور" (بہار نمبر) = مدیر: زیب عثمانیہ لدھیانوی
صفحات: ۱۵۲۔ قیمت: ۱۰ روپے
پتا: ماہنامہ "حور"، ۲۲۔ خالد اسٹریٹ (حور اسٹریٹ) نشتر روڈ، لاہور (پاکستان)

○ ماہنامہ "ماہِ نو" = مدیر کشور ناہید
صفحات: ۸۴۔ قیمت: ۴ روپے
پتا: ۱۳۲ اے، حبیب اللہ روڈ۔ لاہور (پاکستان)

○ ماہنامہ "افکار" = مدیر: صہبا لکھنوی
صفحات: ۸۴۔ قیمت: ۶ روپے
پتا: مکتبہ افکار۔ رابسن روڈ، کراچی (پاکستان)

○ ماہنامہ "سب رس" مدیر: خواجہ حمید الدین شاہد
صفحات: ۴۰۔ قیمت: ۴ روپے
پتا: ڈی/۱۴۳ بلاک بی تیموریہ۔ ناظم آباد کراچی (پاکستان)

○ ماہنامہ "نگار" = مدیر: ڈاکٹر فرمان فتح پوری ــ صفحات: ۸۸۔ قیمت: ۵ روپے
پتا: سی ۲۸۔ بلاک ۱۳ ڈی۔ گلشنِ اقبال، کراچی (پاکستان)

انجمن کی مطبوعات

حوالے کی کتابیں

قاموس الکتب ۔ جلد اوّل ۔ دوم ۔ سوم

مخطوطات کتب خانہ انجمن ترقی اردو (اردو)

مخطوطات انجمن ترقی اردو ۔ فارسی، عربی

ماخذ ۔ شعرا و مشاہیر

تقویم سنہ ہجری، عیسوی

شاہانِ اودھ کے کتب خانے

لغات

اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

اسٹوڈنٹس انگریزی اردو ڈکشنری

پاپولر انگریزی اردو ڈکشنری

پاکٹ انگریزی اردو ڈکشنری

اردو انگلش ڈکشنری

لغت کبیر مشتمل بر الف ممدودہ

لغت کبیر مشتمل بر الف مقصورہ

تحقیق و تنقید

نصرتی ۔ مرتبہ بابائے اردو

مرحوم دلی کالج ۔ بابائے اردو

اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ۔ بابائے اردو

مقالات گارسن دتاسی

خطبات گارسن دتاسی

اردو تھیٹر ۔ عبدالعلیم نامی

عبدالغفور نساخ — مولفہ ڈاکٹر محمد الحق

اختر شیرانی — مولفہ ڈاکٹر یونس حسنی

محمد تقی میر — ڈاکٹر جمیل جالبی

سلہٹ میں اردو — محمد عبدالجلیل بسمل

ظفر علی خاں بہ حیثیت شاعر — ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی

اردو تنقید کا ارتقا — ڈاکٹر عبادت بریلوی

اردو فکشن — اختر انصاری

جمالیات اور اردو ادب — ڈاکٹر ریاض الحسن

سنگھاسن بتیسی — افسر صدیقی

رسالہ شگن — ـ

منکرین اسلام — مولفہ عبیداللہ قدسی

مرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزمِ ادب ۔ سید حسام الدین راشدی

ہفت مقالہ — مرتبہ سید حسام الدین راشدی

جگر ۔ حالات و افکار — ڈاکٹر احمد رفاعی

بابائے اردو مولوی عبدالحق ۔ حیات اور کارنامے

تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ۔ مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

نئے خزانے

یہ اشاریہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

زبان و ادب

ادب و تنقید

اردو زبان، لسانیات

املا ــ مسائل و مباحث

ادارے ــ علمی، ادبی، تعلیمی

تحقیق و تنقید

ترجمہ و تدوین

خطوط و نوادر

خود نوشت

شاعری

ناول، افسانہ وغیرہ

اقتصادیات

تاریخ و سیاست

تعلیم

سیر و سیاحت

شخصیات

علامہ اقبال

مولانا آزاد

غلام احمد پرویز

علامہ عرشی

قائد اعظم

قیوم راہی

منظر علی خاں

وکٹر ہیوگو

ادبا و شعرا

تاریخی و سیاسی شخصیات

دینی شخصیات

علمی تاریخی شخصیات

صحابہ و تابعین رض

طب اور فنون لطیفہ

کتابیات

مذہبیات

سیرت نبوی ؐ

قرآنیات و تفسیر

مسائل و مباحث

اس اشاریے کی تیاری میں نومبر ۱۹۸۵ء تا فروری ۱۹۸۶ء اور دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل سے مدد لی گئی ہے

ماہنامہ اخبار اردو	اسلام آباد	نومبر ۱۹۸۵ء تا فروری ۱۹۸۶ء	ماہنامہ فکر و نظر	اسلام آباد	اکتوبر ۱۹۸۵ء
سہ ماہی اردو	کراچی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء	〃 فنون	لاہور	نومبر دسمبر ۱۹۸۵ء
ماہنامہ اردو ادب	راولپنڈی	جنوری ۱۹۸۶ء	〃 فیض الاسلام	راولپنڈی	جنوری تا فروری ۱۹۸۶ء
ماہنامہ اردو نامہ	لاہور	نومبر ۱۹۸۵ء تا فروری ۱۹۸۶ء	〃 قومی زبان	کراچی	نومبر ۱۹۸۵ء تا فروری ۱۹۸۶ء
〃 اظہار	کراچی	ستمبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء	〃 محدث	لاہور	اکتوبر ۱۹۸۵ء تا 〃 〃
〃 افکار	〃	جنوری فروری ۱۹۸۶ء	〃 میثاق	〃	دسمبر 〃 تا 〃 〃
〃 الانسان	〃	دسمبر ۱۹۸۵ء	〃 نگار پاکستان	کراچی	〃 〃 تا جنوری 〃
〃 البلاغ	〃	دسمبر ۱۹۸۵ء تا فروری ۱۹۸۶ء	〃 نوبہار	ایبٹ آباد	نمبر ۱۰ تا ۱۳
〃 الحق	اکوڑہ خٹک	اکتوبر ۱۹۸۵ء تا جنوری 〃	〃 وجدان	کراچی	نومبر ۱۹۸۵
〃 العلم	کراچی	جولائی تا دسمبر ۱۹۸۵ء	پندرہ روزہ تعمیر حیات	لکھنؤ	۲۵ نومبر ۱۹۸۵ء تا ۱۰ فروری ۱۹۸۶ء
〃 انجمن	〃	اکتوبر ۱۹۸۵ء تا جنوری ۱۹۸۶ء	〃 خبرنامہ طب	لاہور	اکتوبر ۱۹۸۵ء تا فروری ۱۹۸۶ء
〃 بینات	〃	دسمبر 〃 〃 〃	〃 صحیفہ اہل حدیث	کراچی	
〃 پیامی	〃	جنوری تا فروری 〃	ہفت روزہ الاسلام	لاہور	نومبر ۱۹۸۵ء تا فروری ۱۹۸۶ء
〃 ترجمان الحدیث	لاہور	دسمبر ۱۹۸۵ء تا فروری 〃	〃 الاعتصام	〃	〃 〃 〃 〃 〃
〃 ترجمان القرآن	〃	— جنوری تا 〃 〃	〃 المنبر	فیصل آباد	〃 〃 〃 〃 〃
〃 الجامعہ	جھنگ	〃 〃	〃 الہام	بہاولپور	〃 〃 〃 〃 〃
〃 حکمت قرآن	لاہور	دسمبر ۱۹۸۵ء تا فروری 〃	〃 انصاف	راولپنڈی	〃 〃 〃 〃 〃
〃 الخیر	ملتان	— جنوری و فروری 〃	〃 تکبیر	کراچی	〃 〃 〃 〃 〃
〃 سب رس	کراچی	نومبر ۱۹۸۵ء تا جنوری 〃	〃 چٹان	لاہور	〃 〃 〃 〃 〃
〃 شام و سحر	لاہور	دسمبر ۱۹۸۵ء	〃 رضاکار	〃	〃 〃 〃 〃 〃
〃 صدائے اسلام	پشاور	〃 〃	〃 کشمیر	راولپنڈی	〃 〃 〃 〃 〃
〃 صوت الاسلام	فیصل آباد	〃 〃 تا جنوری ۱۹۸۶ء	〃 ہماری زبان	دہلی	۱۵/۲۲ نومبر
〃 طلوع اسلام	لاہور	〃 〃 تا 〃 فروری 〃	〃 آئین	لاہور	۲۵ نومبر ۱۹۸۵ء ۲۵ فروری ۱۹۸۶ء
〃 فاران	کراچی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵			

ادب وتنقید

احمد ندیم قاسمی	ایک گراں بہا مقالہ	قومی زبان، کراچی	جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۳۵
اختر حسین ڈاکٹر	فرد کی نوائے سوختہ	افکار ”	” ”	ص ۱۲
اسلم فرخی، ڈاکٹر	سفر ہے شرط	قومی زبان ”	دسمبر ”	ص ۵۷
اظہار الحق، محمد	ادب اور ادیب — پاکستان کے نقطۂ نظر سے ایک تجزیہ	فنون، لاہور	نومبر ”	ص ۸۷
جبرا ابراہیم جبرا/ محمد کاظم (ترجمہ)	ادب و فن میں نقطۂ عروج	” ”	” ”	ص ۲۴
جمیل صدیقی، میاں	نژاد نو اور عصر جدید	نوبہار، ایبٹ آباد	نمبر ۱۰	ص ۱۷
حسن اختر، ڈاکٹر	اشاریت کیا ہے؟	نگار پاکستان، کراچی	جنوری ”	ص ۴۰
خاطر غزنوی، پروفیسر	ہمارے ادب کے آفاقی رشتے	نوبہار، ایبٹ آباد	نمبر ۱۲ ۱۹۸۵ء	ص ۱۷
خسروی	وہی سب کچھ ہے	اظہار، کراچی	نومبر ”	ص ۲۴
ذکاء اللہ لودھی جسٹس	اجالوں کا سفر	نوبہار، ایبٹ آباد	نمبر ۱۱	ص ۷
سلیم اختر، ڈاکٹر	انشائیہ کا اسلوب	فنون، لاہور	نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۷۰
شہزاد احمد	داہنے ہاتھ کا ہنر	” ”	”	ص ۵۵
کشفی، ڈاکٹر سید ابوالخیر	ہمارے ادب کے آفاقی رشتے	نوبہار، ایبٹ آباد	نمبر ۱۱	ص ۱۹
مجتبیٰ حسین، پروفیسر	دانشور	افکار، کراچی	فروری ۱۹۸۶ء	ص ۱۲
محمد ارشاد	روایت اور جدیدیت (۲)	فنون، لاہور	نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۲۶
محمد محسن، ڈاکٹر	ادب میں جدیدیت — ایک نفسیاتی جائزہ	قومی زبان، کراچی	نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۵۳
نعیمہ جمالی	خاندان ایک — زبانیں مختلف	اظہار، ”	ستمبر ”	ص ۳۱

اردو زبان، لسانیات

ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید	ہندوستان کا اسلامی ادبی دبستان	تعمیر حیات، لکھنؤ	۲۵ جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۵
انصار ناصری و شبیر حسین شاہ	بالمشافہ (ڈاکٹر قریشی سے انٹرویو)	اخبار اردو، اسلام آباد	دسمبر ۱۹۸۵ء	ص ۱۱
حسام الدین راشدی، پیر	اردو زبان کا مولد — سندھ	العلم، کراچی	جنوری ”	ص ۵۹
حنیف کنہائی	مورشس میں اردو	قومی زبان، ”	۱۹۸۶ء	ص ۵۷
شیدا محمد ساکاخیل	اردو زبان کا آغاز وار	سب رس، ”	نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۲۲

رمضان انور، محمد	پنجاب میں اردو ۔ قدیم کا مطالعہ	اردو نامہ	لاہور	دسمبر ۱۹۸۵ء	ص ۵
	؍؍	؍؍	؍؍	فروری ۱۹۸۶ء	ص ۹
عبدالرفیق	پنجاب میں دفتری زبان اردو یا پنجابی؟	؍؍	؍؍	نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۱۹
	مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اردو زبان	؍؍	؍؍	دسمبر ۱۹۸۶ء	ص ۱۱
عبداللہ، ڈاکٹر سید	کیا ہماری بھی کوئی زبان ہے؟	قومی زبان	کراچی	فروری ؍؍	ص ۱۳
عبداللہ، ڈاکٹر سید	نفاذِ اردو	اخبارِ اردو	اسلام آباد	دسمبر ۱۹۸۵ء	ص ۱
کلیم، سعد اللہ	نفاذ اردو کی نفسیاتی جہت	؍؍	؍؍	فروری ۱۹۸۶ء	ص ۳
ماجد الباقری	الفاظ کا صحیح استعمال	اردو نامہ	لاہور	نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۱۳
مختار زمن	کیا اردو زبان واقعی کم مایہ ہے؟	قومی زبان	کراچی	؍؍	ص ۳۹
فرمان فتحپوری، ڈاکٹر	اردو اور تقلید زبان	اردو نامہ	لاہور	؍؍	ص ۶
مخمور اکبر آبادی	قاموس الفصاحت	انجمن	کراچی	اکتوبر ؍؍	ص ۹۷
	؍؍	؍؍	؍؍	دسمبر ؍؍	ص ۱۰۵
	؍؍	؍؍	؍؍	جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۱۱۳
نفیر اعظم	جناب غلام ربانی آگرو سے ایک ملاقات	اخبار اردو	اسلام آباد	نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۴
نظر، ڈاکٹر انصار اللہ	دکنی اردو کا آغاز و ارتقا	نگار پاکستان	کراچی	جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۷
وحید قریشی، ڈاکٹر	ڈاکٹر معظم علی صدیقی سے ایک ملاقات	اخبار اردو	اسلام آباد	فروری ۱۹۸۵ء	ص ۵
ہاشمی فرید آبادی	سخن یا اعجاز سخن	العلم	کراچی	اکتوبر ؍؍	ص ۴۳

املا ۔ مسائل و مباحث

پال رابسن / آصف فرخی (مترجم)	لکھنا	قومی زبان	کراچی	دسمبر ۱۹۸۵ء	ص ۴۰
رشید حسن خاں	اردو املا کے چند اہم مسائل۔	؍؍			
	گنتیوں کو لفظوں میں لکھنا	اردو	کراچی	اکتوبر ۱۹۸۵ء	ص ۴۵
عبداللہ، ڈاکٹر سید	اردو میں املا اور رموز اوقاف کے مسائل	اخبار اردو	اسلام آباد	جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۲۳
محمد سعید، میاں	گذارش یا گزارش	قومی زبان	کراچی	دسمبر ۱۹۸۵ء	ص ۲۲
—	املا اور رموزِ اوقاف کے مسائل (روداد سمینار ۱۹۸۵ء)	اخبار اردو	اسلام آباد	جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۱
—	روداد و سفارشات کمیٹی برائے سفارشات املا اور رموز اوقاف	؍؍	؍؍	؍؍ ؍؍	ص ۱۳

ادارے علمی، ادبی، تعلیمی

تبسم، عطا محمد	انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے چیئرمین معظم سے انٹرویو	تکبیر، کراچی ۱۲ر	فروری ۱۹۸۶ء	ص ۹
زینت جہاں	سندھ مدرستہ الاسلام	اظہار، "	ستمبر ۱۹۸۵ء	ص ۵۷
عرفانی، عبدالمالک (مترجم)	کمیشن برائے خواندگی و عوامی تعلیم کا قیام	اخبار اردو، اسلام آباد	نومبر "	ص ۹
	اکادمی ادبیات پاکستان	"	دسمبر "	ص ۱۷
	قائداعظم اکادمی	"	" "	ص ۱۹
	قومی کتاب کونسل پاکستان	"	فروری "	ص ۹
عطش درانی	مغربی ممالک میں ترجمے کے قومی اور عالمی مراکز	"	نومبر "	ص ۱
نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر	دارالعلوم دیوبند	الحق، اکوڑہ خٹک	دسمبر "	ص ۵
وجیہی محمد شعاع اللہ	مدرسہ عالیہ رام پور	فاران، کراچی	اکتوبر "	ص ۱۹

تحقیق و تنقید

ابوسلمان شاہجہان پوری، ڈاکٹر	انجمن ترقی اردو کے رسائل	اخبار اردو، اسلام آباد	فروری ۱۹۸۶ء	ص ۱۴
اسلم، سراج الدین	حسین بن منصور حلاج "دشت سوس" میں	فنون، لاہور	نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۱۳۶
انور سدید، ڈاکٹر	کچھ وقت ہندستانی کتابوں کے ساتھ	قومی زبان، کراچی	دسمبر "	ص ۳۵
بوعلی سینا / محمد سعید قریشی (مترجم)	رسالہ عشق	اردو، "	اکتوبر "	ص ۵
شکیب ایاز، ڈاکٹر	قاضی عبدالودود کے پہلے مقالے کی بازیافت	قومی زبان، "	جنوری "	ص ۴۷
ظفر اقبال	بندلیوں کی چیخ ـ ایک مطالعہ	نگار پاکستان، "	" ۱۹۸۶ء	ص ۷۳
کہکشاں ملک	خوشبوؤں کا باغ (از انور سجاد) ایک جائزہ	فنون، لاہور	نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۱۲۴
محمود الرحمٰن، ڈاکٹر	اردو میں بچوں کے لیے سیرت کا ادب	اخبار اردو، اسلام آباد	دسمبر "	ص ۳
وزیر آغا، ڈاکٹر	آئینہ اور چراغ	قومی زبان، کراچی	جنوری "	ص ۳۸
	ایوانِ اردو کے کتب خانے	سب رس، "	نومبر "	ص ۲۵

تدوین و ترجمہ کے مسائل

حسرت کاس گنجوی، ڈاکٹر	تدوینِ کتاب کا فنی پہلو	العلم، کراچی	اکتو ۱۹۸۵ء	ص ۲۰
محمد بخش ہاشمی	اردو زبان میں ترجمے کے مسائل (روداد سیمینار)	اخبار اردو، اسلام آباد	جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۴۶

مرتضیٰ اختر جعفری، ڈاکٹر	ادب میں تراجم کی اہمیت	پشاور یونیورسٹی جرنل	۸۶-۱۹۸۵ء	ص ۱۷

خطوط و نوادر

اقبال	خط (غیر مطبوعہ) بنام پروفیسر الیاس برنی	سب رس، کراچی	نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۱۷
اکرام چغتائی، محمد	ایک نادر مجموعۂ مکاتیب (۵)	اردو، 〃	اکتوبر 〃	ص ۱۳۵
ظفر اقبال، ڈاکٹر	چند تاریخی نوادر	قومی زبان، 〃	نومبر 〃	ص ۳۱
عبدالحق، بابائے اردو مولوی	نادر خطوط	〃 〃	فروری ۱۹۸۶ء	ص ۵
مختار الدین احمد، ڈاکٹر	مکاتیب قاضی عبدالودود	〃 〃	جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۱۵
نیاز فتحپوری، علامہ	مکتوبات نیاز	نگارِ پاکستان، 〃	دسمبر ۱۹۸۵ء	ص ۳

خودنوشت

اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، مولانا	بنام پروفیسر ڈاکٹر محمود بریلوی (خودنوشت)	العلم، کراچی	اکتوبر ۱۹۸۵ء	ص ۷۸
جابر علی، سید	ایک ادبی خودنوشت	فنون، لاہور	نومبر 〃	ص ۸۱

شاعری

مجتبیٰ حسین، پروفیسر	اردو مرثیہ نگاری میں جدید رجحانات	اظہار، کراچی	ستمبر ۱۹۸۵ء	ص ۳۶
طاہرہ، قرۃ العین	جدید غزل میں رجائیت	اردو ادب، راولپنڈی	جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۹
مسعود ہاشمی، پروفیسر سید	شاعری میں فکری معنویت	سب رس، کراچی	دسمبر ۱۹۸۵ء	ص ۱۳
نذیر تبسم	اردو مثنوی دکنی عہد میں	پشاور یونیورسٹی جرنل	۸۶-۱۹۸۵ء	ص ۵۰
یوسف حسن	لوک گیت	اردو ادب، راولپنڈی	جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۶

ناول، افسانہ وغیرہ

ابوسعید نورالدین، ڈاکٹر	اردو افسانہ بنگلہ دیش میں	اردو، کراچی	اکتوبر ۱۹۸۵ء	ص ۱۱۳
احمد یوسف	ہندستان میں اردو افسانے کے مسائل	قومی زبان 〃	فروری ۱۹۸۶ء	ص ۵۷
سلطانہ بخش، ڈاکٹر ایم	داستانوں میں اسلامی اقدار و تہذیب	〃 〃	〃 〃	ص ۲۵
فرمان فتحپوری، ڈاکٹر	اردو۔ رجحانات کی روشنی میں	نوبہار ایبٹ آباد ۱۳		ص ۱۵
ممتاز احمد خاں	اردو ناول نظر انداز شدہ صنف ادب	قومی زبان، کراچی	دسمبر ۱۹۸۵ء	ص ۷۴

اقتصادیات

حامد میاں، مولانا	دورِ حاضر کے اقتصادی مسائل (۲)	صوت الاسلام، فیصل آباد	جنوری ۱۹۸۷ء	ص ۱۷
درشہوار ابراہیم	اجتماعی فلاح کا اسلامی نظام اور زکوٰۃ کا کردار	اظہار، کراچی	ستمبر ۱۹۸۵ء	ص ۵
سیاح الدین کاکاخیل، مفتی سیّد	مروجہ بیمہ کی شرعی حیثیت	فکر و نظر، اسلام آباد	اکتوبر 〃	ص ۳
شہاب، پروفیسر رفیع اللہ	مضاربت اور بلاسود بنکاری	حکمتِ قرآن، لاہور	فروری 〃	ص ۵۹
ظفر الاسلام، ڈاکٹر	عباسی دور کی انفرادی بنکاری پر ایک نظر	الحق، اکوڑہ خٹک	نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۴۳

تاریخ و سیاست

ابوالحسن علی ندوی، مولانا سیّد	ہندستان میں مسلم پرسنل لا کا مسئلہ	میثاق، لاہور	دسمبر ۱۹۸۵ء	ص ۸۵
〃	〃	〃	جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۸۱
ابوالعلا چشتی	فاران کی پہاڑی کا نام	صوت الاسلام فیصل آباد	دسمبر ۱۹۸۵ء	ص ۴۹
اسرار احمد، ڈاکٹر	غزوہ بدر — پر سلسلہ اسلامی انقلاب	میثاق، لاہور	〃 〃	ص ۴۹
〃	غزوہ بدر سے صلح حدیبیہ تک 〃	〃 〃	جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۵۷
اسرار احمد، ڈاکٹر	استحکامِ پاکستان (مقدمہ)	〃 〃	〃 〃	ص ۷
〃	〃 (۲)	〃 〃	فروری 〃	ص ۳۳
اسرار احمد	امتِ مسلمہ کے لیے لائحہ عمل (۲)	حکمتِ قرآن 〃	دسمبر 1985ء	ص ۱۸
〃	〃 (۳)	〃 〃	جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۱۱
الطاف علی قریشی	نہر زبیدہ	فکر و نظر، اسلام آباد	اکتوبر ۱۹۸۵ء	ص ۱۲۱
اندرابی مہدی	ایلورا کے غار	الانسان، کراچی	دسمبر 〃	ص ۱۸
آصف بھلی	نواب زادہ نصر اللہ خاں سے ایک تفصیلی ملاقات	چٹان، لاہور	جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۱۰
〃	محمد حنیف رامے سے انٹرویو	〃 〃 ۲۷ر 〃	〃	ص ۲۵
〃	ولی خاں 〃 〃	〃 〃 ۱۰ر فروری	〃	ص ۹
آصف النور زادہ	خواجہ خیر الدین 〃 〃	〃 〃 ۲۰ر جنوری	〃	ص ۱۱
بشیر عثمانی، محمد	نظریۂ پاکستان اور قائدِ اعظم	انصاف، راولپنڈی	۳۱ر دسمبر ۱۹۸۵ء	ص ۳
پاؤلو اپولیتو	ایک خط جو اپنی تلاش میں ہے	پیامی، کراچی	فروری ۱۹۸۶ء	ص ۲۳

بزاز، پنڈت پریم ناتھ/عبدالحمید نظامی (مترجم)				
	اِن سائیڈ کشمیر (۰۰)	کشمیر، راولپنڈی	۱۹ نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۴
	" (۱)	" "	۲۶ " "	" "
	" (۲)	" "	۳ دسمبر "	" "
	" (۳)	" "	۱۰ " "	" "
	" (۴)	" "	۱۷ " "	" "
	" (۵)	" "	۱۴ جنوری ۱۹۸۶ء	" "
	" (۷)	" "	۴ فروری "	" "
	" (۸)	" "	۱۱ " "	" "
جیو والی۔	ایک ثقافتی سنگم	پیامی، کراچی	فروری "	ص ۴۰
چٹان	پروفیسر غفور احمد سے ملاقات	چٹان، لاہور	۲۰ جنوری "	ص ۱۵
رامون مارگالف	بحیرۂ روم کا ایک رخ	پیامی، کراچی	فروری "	ص ۳۶
رفیق افغان	اتحاد اسلامی مجاہدین افغانستان کے گلبدین حکمت یار سے گفتگو	تکبیر، کراچی	۲۷ دسمبر ۱۹۸۵ء	ص ۵۰
	الفتح غنڈے سے کوہِ لکھن کی چوٹی تک	" "	۱۷ جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۱۲
زاہد اشرف	شورائی نظام	المنبر، فیصل آباد	۲ نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۱۷
ساجد الرحمٰن	اسلام اور قومیت	الہام، بہاولپور	۱۴ فروری "	ص ۲
سالوادور جینز	بحیرۂ روم کے یورپی حصے میں تبدیلی اور روایت	پیامی، کراچی	فروری ۱۹۸۶ء	ص ۱۳
سلمان باقر، آغا	آقائے محمد حسن شیرازی (انٹرویو)	رضاکار، لاہور	۲۴ نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۵
سلیم مورکوس	زیر آب آثاریات کا نقطۂ آغاز	پیامی، کراچی	فروری ۱۹۸۶ء	ص ۴۲
شاہد صدیقی	جگ جیت سنگھ چوہان اور خالصتان کا قیام (انٹرویو)	تکبیر، کراچی	۲۹ نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۱۹
شفیق حسن، مرزا	جموں و کشمیر۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۷ء تک لاہور کے اخبارات کے آئینے میں (۱۳۰)	کشمیر، راولپنڈی	۱۹ نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۴
	جموں و کشمیر۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۷ء تک لاہور کے اخبارات کے آئینے میں (۱۳۱)	کشمیر، راولپنڈی	۲۶ نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۴

بزاز، پنڈت پریم ناتھ/عبدالحمید نظامی (مترجم)

	اِن سائیڈ کشمیر	(۷۰)	کشمیر، راولپنڈی ۱۹ر نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۴
	〃	(۷۱)	〃 〃 ۲۶ر 〃	〃
	〃	(۷۲)	〃 〃 ۳ر دسمبر 〃	〃
	〃	(۷۳)	〃 〃 ۱۰ر 〃	〃
	〃	(۷۴)	〃 〃 ۱۷ر 〃	〃
	〃	(۷۵)	〃 〃 ۱۴ر جنوری ۱۹۸۶ء	〃
	〃	(۷۷)	〃 〃 ۴ر فروری 〃	〃
	〃	(۷۸)	〃 〃 ۱۱ر 〃	〃
جیو والی۔	ایک ثقافتی سنگم		پیامی، کراچی فروری 〃	ص ۴۰
چٹان	پروفیسر غفور احمد سے ملاقات		چٹان، لاہور ۲۰ر جنوری 〃	ص ۱۵
راموں مارگالف	بحیرۂ روم کا ایک رخ		پیامی، کراچی فروری 〃	ص ۳۶
رفیق افغان	اتحاد اسلامی مجاہدین افغانستان کے گلبدین حکمت یار سے گفتگو		تکبیر، کراچی ۲۷ر دسمبر ۱۹۸۵ء	ص ۵
	الفتح غنڈ سے کوہِ لکھن کی چوٹی تک		〃 〃 ۱۷ر جنوری ۱۹۸۶ء	ص ۱۲
زاہد اشرف	شورائی نظام		المنبر، فیصل آباد ۲ر نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۱۷
ساجد الرحمٰن	اسلام اور قومیت		الہام، بہاولپور ۱۴ر فروری 〃	ص ۲
سالو ادورجینز	بحیرۂ روم کے یورپی حصّے میں تبدیلی اور روایت		پیامی، کراچی فروری ۱۹۸۶ء	ص ۱۳
سلمان باقر، آغا	آقائے محمد حسن شیرازی (انٹرویو)		رضاکار، لاہور ۲۴ر نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۵
سلیم مورکوس	زیرِ آب آثاریات کا نقطۂ آغاز		پیامی، کراچی فروری ۱۹۸۶ء	ص ۴۲
شاہد صدیقی	جگ جیت سنگھ چوہان اور خالصتان کا قیام (انٹرویو)		تکبیر، کراچی ۲۹ر نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۱۹
شفیق حسن، مرزا	جموں و کشمیر۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۷ء تک لاہور کے اخبارات کے آئینے میں (۱۳۰)		کشمیر، راولپنڈی ۱۹ر نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۴
	جموں و کشمیر۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۷ء تک لاہور کے اخبارات کے آئینے میں (۱۳۱)		کشمیر، راولپنڈی ۲۶ر نومبر ۱۹۸۵ء	ص ۴

Regd. S No. 1138

Phone: 724023

Monthly

QAUMI ZABAN

Karachi

انجمن کی مجوزہ عمارت کا نقشہ

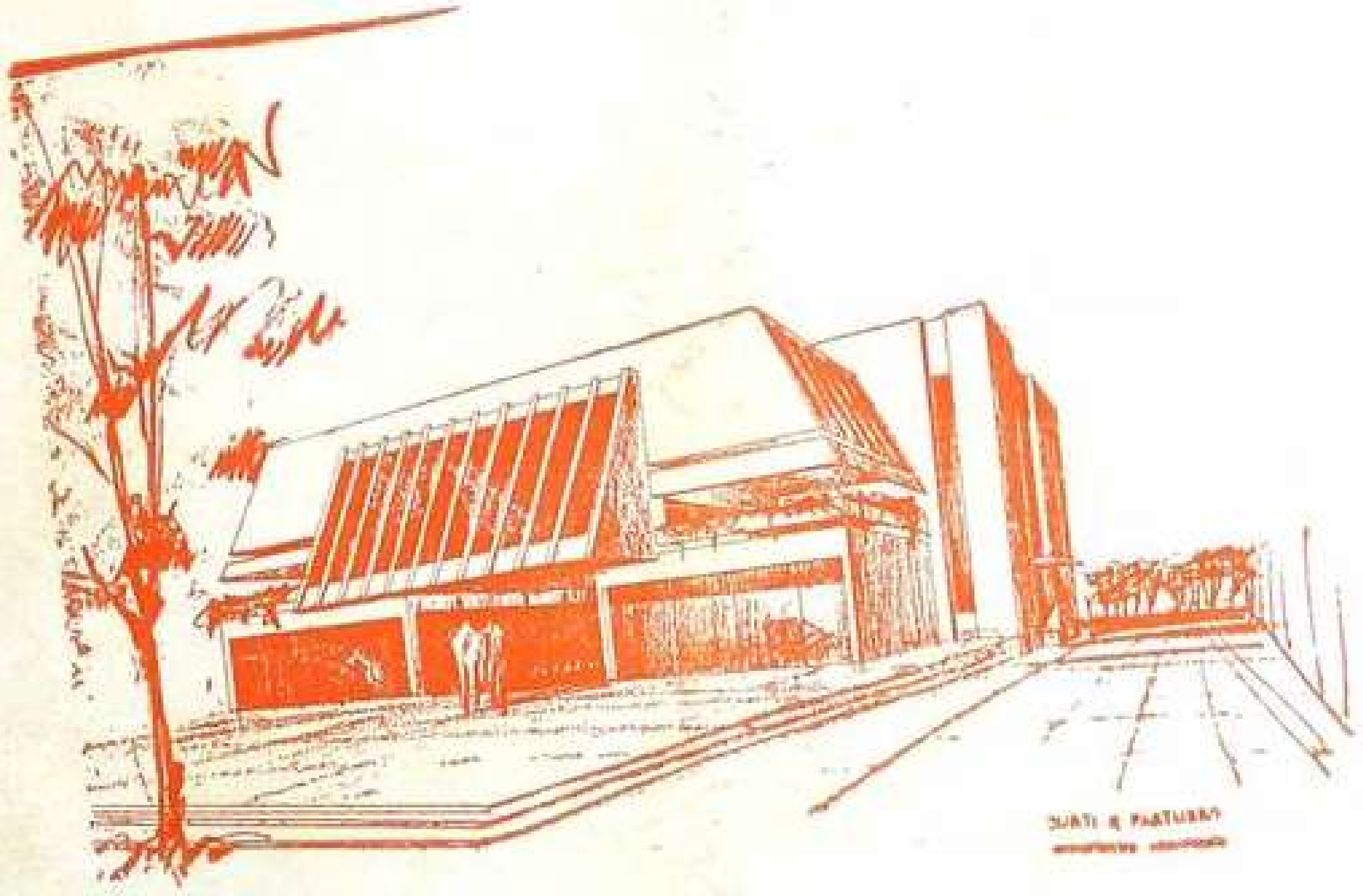

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر :- ادیب سہیل کلیم الحسن نقوی کے زیر اہتمام انجمن پریس کراچی میں چھپ کر انجمن ترقی اردو (پاکستان) - بابائے اردو روڈ - کراچی سے شائع ہوا -